عقیدہ و منہج

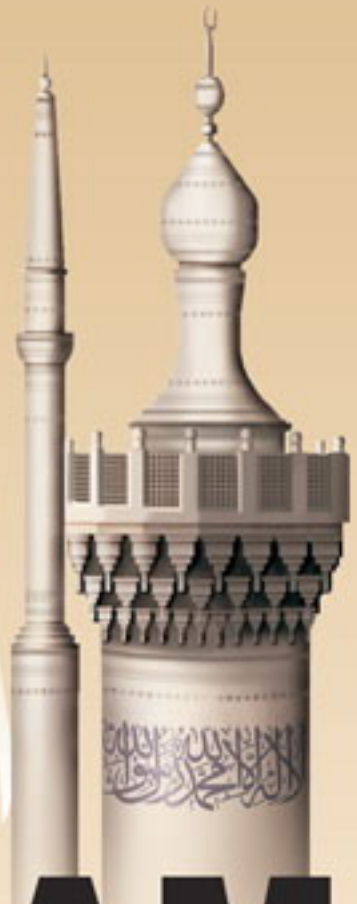

ISLAM

حافظ محمد سعید

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

دار الاندلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقیدہ و منہج

۱	انسان کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟	۱۱
۲	مخلوق کسی حادثہ یا ارتقاء کی پیداوار نہیں:	۱۲
۳	عبادت کیا ہے؟	۱۴
۴	کیا داڑھی میں اسلام نہیں؟	۱۷
۵	اللہ کی عبادت کیسے ہو؟	۲۱
۶	صوفیاء میں عبادت کے مختلف طریقے	۲۱
۷	نماز، روزہ اور اقامتِ دین	۲۲
۸	سنت کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کیوں؟	۲۴
۹	شریعت کے مطابق حکومت کرنا	۲۹
۱۰	اسلام نافذ کرنے کے لیے الیکشن کی شرعی حیثیت	۳۴
۱۱	غلبۂ اسلام کا طریقہ	۳۶
۱۲	جہاد سے پہلے دعوت	۳۶
۱۳	تلوار کے ذریعے اسلام پھیلنے کا مطلب	۳۸
۱۴	''دین میں جبر نہیں'' کا مطلب	۴۰
۱۵	کیا اللہ کی عبادت خوف اور طمع کے لالچ کے ساتھ کی جائے	۴۲

۱۶	اللہ سے کچھ نہ مانگنا اور دعا نہ کرنا تکبر ہے	۴۵
۱۷	بعض شبہات کا ازالہ	۴۸

عبادت میں احسان

۱	عبادت میں احسان	۵۴
۲	ایک مسلمان کے لیے ضروری علم	۵۶
۳	نماز، ورزش اور اٹھک بیٹھک کے لیے نہیں	۵۷
۴	نماز میں خیالات وساوس کی وجہ	۵۸
۵	کیا اللہ کو دنیا میں دیکھا جاسکتا ہے؟	۶۱

توحید کی اقسام اور فوائد

۱	رسولوں کی بعثت کا مقصد	۶۸
۲	دعوت کیا ہے؟	۷۰
۳	طاغوت کیا ہے؟	۷۱
۴	دین میں توحید کی حیثیت	۷۳
۵	توحید ربوبیت	۷۴
۶	دو شبہات کا ازالہ (اللہ اور بندے کے اختیار میں فرق)	۷۹
۷	توحید الوہیّت	۸۱
۸	توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کی دلیل ہے	۸۵

۹	توحید.....سب سے زیادہ حساس مسئلہ	۸۷
۱۰	شبہے کا ازالہ	۸۸
۱۱	توحید الاسماء والصفات	۹۲
۱۲	اللہ کے نام اللہ کی صفتیں بیان کرتے ہیں	۹۳
۱۳	تحریف	۹۵
۱۴	تعطیل	۹۵
۱۵	تمثیل یا تشبیہ	۹۶
۱۶	کیفیت یا حالت بیان کرنا	۹۶
۱۷	تفویض	۹۷

عقیدۂ سلف

۱	عقیدۂ سلف	۹۸
۲	ایک ضروری وضاحت	۱۰۱
۳	عقیدۂ سلف کے فوائد اور انحراف کے مضمرات	۱۰۳

توحید الحکم (حاکمیت میں توحید)

۱	توحید الحکم (حاکمیت میں توحید)	۱۰۷
۲	اللہ سے بغاوت کا نیا انداز	۱۱۲
۳	اسلامی جمہوریت کا دھوکا	۱۱۵

۴	اللہ کی حاکمیت اور نبی ﷺ کی اطاعت	۱۱۶
۵	اسلام اور جمہوریت	۱۱۸
۶	حکومت کا قانون بنانا	۱۱۹
۷	امورِ حکومت اور غلطی کے شکار علماء کے تین طبقے	۱۲۳
۸	ہماری عافیت اللہ کا حکم قائم کرنے میں ہی ہے	۱۲۵
۹	دین محض حکومت کے حصول کا نام نہیں	۱۲۶
۱۰	توحید سے دوری شخصیت پرستی کو جنم دیتی ہے	۱۳۴
۱۱	اصلاح اور دعوت کا طریقہ کار	۱۳۶
۱۲	دعوتِ دین کی بنیاد قرآن وحدیث ہے	۱۳۸
۱۳	سلف کا اسلوبِ دعوت	۱۴۰

فرشتوں پر ایمان

۱	فرشتوں پر ایمان کی حقیقت	۱۴۲
۲	قرآن وحدیث میں فرشتوں کے متعلق معلومات	۱۴۴
۳	کائنات کے غیبی حقائق اور سائنسی علوم	۱۴۸
۴	فرشتوں کی ذمہ داریاں	۱۵۲
۵	فرشتوں کی عمومی صفات	۱۵۵
۶	فرشتوں پر ایمان کی حکمتیں	۱۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَ بَعْدُ.....!

یہ مضامین ماہنامہ مجلّہ ''الدعوۃ'' میں اقساط کی شکل میں بہ عنوان ''عقیدہ ومنہج'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان تمام اقساط کو جمع کر کے ایک کتابچہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تا کہ وہ دوست جو ان اقساط کو پڑھنے سے محروم رہے، کتابی شکل میں اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس کتاب میں عقیدہ ومنہج پر بحث کی گئی ہے، جس میں انبیاء کے اسلوبِ دعوت کو معیار بنایا گیا ہے۔ فلسفیانہ بحثوں اور علمِ کلام کے گورکھ دھندوں کی بجائے دین کو سمجھنے کے لیے توحید کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس میں عقائد پر بحث کے ساتھ اسلام کے سب سے اہم اور اساسی مسئلہ توحید کو بڑے اختصار کے ساتھ ضبطِ تحریر کیا گیا ہے کہ جس پر اُخروی نجات کا دارو مدار ہے۔ اس میں جہاں باطل فرقوں معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے نظریات کا ردّ کیا گیا ہے، جن کی مختلف شکلیں آج بھی افسوسناک طور پر مسلمانوں کے عقائد میں کارفرما ہیں۔ اس کے ساتھ عصر حاضر کے جدید سیاسی نظاموں میں جس طرح اسلامی نظریات کو شامل کیا گیا ہے ان کو بھی بڑے شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

یہ مجموعہ مضامین دعوت کا کام کرنے والوں کیلئے بھی مفید ہے اور عام قارئین کیلئے بھی۔ اس کا انداز بیان، عام فہم، سادہ اور دلنشین ہے۔ بڑی پیچیدہ اور مشکل مباحث اور مسائل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نہایت آسان پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ محترم پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ امیر جماعۃ الدعوۃ کے عقیدہ و منہج پر مختلف تربیتی مجالس میں دیئے گئے ان کے لیکچرز سے مرتب کیا گیا ہے، جسے جناب قاضی کاشف نیاز نے تحریری اسلوب میں بڑی محنت سے تحریر کی شکل میں کیا ہے ان میں سے چند اسباق محترم حافظ صاحب نے اپنے قلم سے بھی لکھے ہیں۔ عقیدہ و منہج کے موضوع پر مختصر کتابچے تو موجود تھے۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس میں عقیدہ و منہج کو پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں قرآن وحدیث اور سلف کے فہم کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ توحید کی اقسام، مفہومِ توحید اور تصورِ جہاد کے بارے میں عام لوگوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ بڑے مناسب اور انتہائی مدلّل جوابات کے ساتھ کیا گیا ہے؛ جس میں افراط ہے نہ تفریط بلکہ اعتدال پر مبنی وضاحتیں ہیں۔

یہ فرمودات دعوتِ دین کے میدان میں سرگرم داعیانِ کتاب وسنت کے لیے ایک بہترین ساتھی ہے۔

میں مدیر ''مجلّہ الدعوۃ'' نوید قمر اور نائب مدیر قاضی کاشف نیاز کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جن کی خاص توجہ اور بھرپور تعاون کے ساتھ مجلّہ الدعوۃ کے صفحات پر چھپنے والے یہ گرانقدر اور مفید مضامین ایک شاندار کتاب کی صورت میں آج آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کتاب کا حصہ اول ہے۔ جلد ہی حصہ دوم بھی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ان شاء اللہ

آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دعوتِ دین کا سرگرم داعی اور بے لوث مبلّغ بنادے۔ آمین

محتاج دعا
ابو ہشام ریاض اسماعیل
دارالاندلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عقیدہ و منہج

عقیدہ و منہج کا سمجھنا دین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انبیاء سب سے پہلے آ کر عقیدے کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ عقیدے کی اصلاح کے ساتھ ہی عمل کی اصلاح ہوتی ہے اور عمل کی اصلاح سے اخلاق و معاملات کی اصلاح ہوتی ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس سارے عمل میں بنیاد عقیدہ ہے ۔ہر مسلمان کو سب سے پہلے اپنے عقیدے کا فہم و شعور حاصل کرنا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ اس کا عقیدہ درست اور عین اسلام کے مطابق ہے یا نہیں کیونکہ نجات کا سارا دارو مدار عقیدے پر ہے۔ اگر عقیدہ درست نہ ہو گا تو اچھے سے اچھا عمل بھی بے کار جائے گا۔

عقیدے میں سب سے پہلا اور بنیاد سوال یہ ہے کہ

انسان کو کیوں پیدا کیا گیا؟

اس کا جواب اللہ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں ہمیں یہ دیا ہے کہ

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالاِنْسَ اِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات:٥٦]

''جنوں اور انسانوں کو ہم نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا))

''اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔''

ہر مذہب اور فلسفے میں یہ سب سے بڑا سوال ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ اسی پر پھر پورے مذہب اور نظام و فلسفے کا انحصار اور دار و مدار ہوتا ہے۔

مخلوق کسی حادثہ یا ارتقاء کی پیداوار نہیں اور نہ خود بخود پیدا ہوئی:

اسلام نے اس بنیادی سوال کا جواب ہمیں یہ دیا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ ہم کسی حادثے کی پیداوار نہیں نہ ہی یہ کائنات کسی حادثے کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی ہے اور نہ یہ خود بخود پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ اور پھر اس کائنات کی تخلیق ارتقاء کے تحت بھی نہیں ہوئی بلکہ جس طریقے سے اللہ نے چاہا، اس کو اس طریقے سے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چار قسمیں کھا کر فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ [العلق:٤]

''ہم نے انسان کو سب سے بہتر شکل میں پیدا کیا۔''

یعنی ایسا نہیں ہے کہ پہلے وہ بندر تھا، پھر بندر سے انسان بن گیا (جیسا کہ بعض مغربی مفکرین ڈارون وغیرہ انسان کی تخلیق کو فلسفۂ ارتقاء کے تحت بیان کرتے ہیں) اور اب انسان سے پتہ نہیں کچھ اور بن جائے گا۔ ظاہر ہے اگر ارتقائی فلسفہ

(Theory of evolution) کے مطابق یہ سلسلہ جاری ہے تو سارے انسان کچھ اور بھی بننا چاہیں گے۔

یہ بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جیسے فلسفے اور نظریات ہوں گے، انسان پر بھی اس کے ویسے ہی اثرات ہوں گے۔ جو لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے یا نہیں مانتے کہ اللہ نے ہمیں پیدا کیا یا اللہ نے ہمیں اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے اور وہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ کائنات ایک حادثے یا ارتقاء کے تحت وجود میں آئی ہے، نباتات سے کیڑے مکوڑے اور کیڑے مکوڑوں سے ہڈی والے جانور اور پھر ان سے بندر اور بندروں سے بڑھتے بڑھتے لاکھوں سال کے ارتقاء کے بعد انسان معرض وجود میں آ گیا۔ ایسے گمراہ اور خود ساختہ فلسفوں کے ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جانوروں کی طرح بننے کی کوشش کرتا ہے۔ جنس سے لے کر رہنے سہنے، بودو باش اور اخلاقیات کے تمام معیار اور خصوصیات جانوروں جیسی اختیار کرنے لگتا ہے۔ اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کھو بیٹھتا ہے۔ یہ ارتقاء کے نکتۂ نظر کو ماننے کے اثرات ہیں۔

دوسری طرف جب یہ بات انسان مان لے کہ اللہ نے پیدا کیا اور اس نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں، اس کا ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک دن جواب دینا ہے۔ مرنے کے بعد آخرت میں ہمارے ایک ایک عمل کا حساب ہو گا، اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تمہیں جس مقصد کے لئے پیدا کیا تھا، بتاؤ وہ مقصد پورا کر کے آئے ہو یا نہیں، جب دل و دماغ میں یہ نکتۂ نظر اور مقصد جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کا رخ یکسر بدل جاتا ہے۔

لیکن جب یہ نکتۂ نظر نہ ہو تو پھر جانوروں کی سی زندگی ہے بلکہ فرمایا: بَلْ هُمْ اَضَلُّ ''جانوروں سے بھی بدتر زندگی ہوتی ہے۔''

عبادت کیا ہے؟

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اس نے اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے، تو اب سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کیا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ:

'' عبادت ان تمام اقوال اور افعال کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ جیسے دعا، نماز، قربانی وغیرہ''

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ'' انسان کے وہ تمام اقوال وا فعال جن سے اللہ راضی ہو جائے، عبادت کہلاتے ہیں۔''

یعنی ایک دو یا چند چیزیں عبادت نہیں ہیں بلکہ انسان کے تمام اقوال و افعال کو جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو، عبادت کہتے ہیں۔وہ فعل انسان کی آنکھ کا بھی ہوسکتا ہے، انسان کے کان کا فعل بھی ہوسکتا ہے یا اس کے ہاتھ کا بھی۔غرض انسان سے ایسے جتنے افعال سرزد ہوں جن سے اللہ راضی ہو، وہ عبادت میں داخل ہیں۔ اسی طرح انسان کے وہ تمام اقوال بھی جن سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو، عبادت میں شامل ہیں اور ان میں صرف یہ نہیں کہ کوئی کہہ دے بس قرآن مجید کا پڑھنا عبادت ہے یا اللہ کا ذکر کر لینا ہی عبادت ہے بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے والے تمام اقوال عبادت ہیں۔کوئی اپنے بھائی کو اچھی نصیحت کرتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔کوئی کسی کو صحیح راستہ بتا دیتا ہے، اس کی درست رہنمائی کرتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے۔غرض صرف نماز پڑھ لینا، روزہ رکھ لینا یا وہ چند چیزیں ہی عبادت نہیں جنہیں عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے بلکہ عبادت بہت ہی جامع چیز ہے۔

عبادت کی جامع ترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ:

﴿اَلْعِبَادَةُ اِسْمٌ جَامِعٌ مَا يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَ يَرْضٰى﴾

''عبادت ایسی جامع چیز ہے جس سے اللہ راضی ہو جائے۔''

جس چیز سے اللہ تعالیٰ خوش ہوجائے'' مِنْ قَولٍ اَوْ فِعْلٍ '' یعنی قول اور فعل سے، وہ عبادت ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے عقیدے کی تعریف یوں بیان فرمائی ہے کہ:

'' انسان کمال عاجزی کے ساتھ اللہ کی کمال محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو یہ عبادت ہے۔''

کمال عاجزی کا مطلب ہے، انسان پوری عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جائے۔ ویسے تو انسان اللہ کے سوا بھی جس سے ڈرتا ہے، اس کے آگے جھک جاتا ہے، لیکن اللہ کے سامنے جھکنے میں صرف ڈرنا یا عاجزی ہی مراد نہیں بلکہ انسان اللہ کے سامنے اپنی تمام قربتوں، تمام چاہتوں اور تمام محبتوں کے ساتھ جھکے تو یہ عبادت ہے۔ اس میں عاجزی اور محبت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یہ ہے عبادت جس میں انسان کے تمام ذاتی افعال بھی شامل ہوتے ہیں اور اجتماعی افعال بھی اور ایسی تمام چیزیں جو اللہ کے ہاں مطلوب ہیں۔

اجتماعی افعال میں سیاست کو ہی لے لیں۔ اگر انسان اسلام کے مطابق سیاست کرے جس سے اللہ خوش ہو تو یہ بھی عبادت ہے۔ یہ اسلامی سیاست ہے جس کا اللہ حکم دیتا ہے۔ اسی طرح معیشت اور تجارت کے وہ تمام طریقے جن کے ذریعے انسان کاروبار کرتا ہے، اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے، اگر یہ طریقے اللہ کے حکم کے مطابق ہوں تو اس کی یہ ساری معاشی کوششیں بھی عبادت میں داخل ہوں گی۔ گویا اگر ہم اللہ

کی رضا کے مطابق تمام کام کریں تو ہمارا سونا جاگنا بھی عبادت ، ہمارا کھانا پینا بھی عبادت ، اٹھنا بیٹھنا بھی عبادت، ہماری سیاست بھی عبادت اور ہماری تجارت بھی عبادت ہوگی۔ یہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے ۔ اگر انسان اللہ کی رضا کے مطابق اپنے سارے کام کرتا ہے تو اس سے انسان کی تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے ۔ اور اگر وہ اس کے برعکس کام کرتا ہے تو گویا وہ اپنی تخلیق کے مقصد سے ہٹ کر غلط کام کر رہا ہے۔ اللہ نے اسے ایسے کاموں کے لئے دنیا میں بھیجا ہی نہیں اور نہ اسے ایسے کام کرنے کی اجازت ہے جن سے اللہ تعالیٰ خوش نہ ہو ۔ اور جن کاموں سے وہ خوش اور راضی ہو ، وہ سب عبادت ہیں۔ ان میں دعا بھی ہے ، نماز بھی ہے ، روزہ بھی ہے، قربانی بھی ہے ۔عبادت کی اس جامع تعریف میں اللہ کو راضی کرنے والی ہر چیز شامل ہے۔ جیسے اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلاتِی وَ نُسُکِی وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴾

[الانعام :۱۶۲]

’’ کہہ دیجئے بے شک میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا ور مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے ۔‘‘

کیا رضائے الٰہی کا حصول ہمارا اصل مقصد اور نصب العین ہے یا عبادت اصل مقصد ہے؟

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہماری تخلیق کا نصب العین یا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ اور عبادت کے ذریعے ہم نے رضائے الٰہی کا حصول کرنا ہے۔ گویا رضائے الٰہی کا حصول نتیجہ ہے عبادت کا ۔ اللہ نے انسان کے لئے جو عبادت کے طریقے مقرر کر دیئے ہیں ، انہی کے ذریعے انسان اللہ کی رضا حاصل کرسکتا ہے ۔اس

کے سوا کسی اور چیز سے رضائے الٰہی حاصل نہیں کی جا سکتی ۔ بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ رضائے الٰہی کا حصول اصل مقصد ہے تو پھر وہ عبادت کو اس کے تابع کر دیتے ہیں۔ عبادت کو اصل مقصد نہیں سمجھتے چنانچہ وہ عبادت یا عبادت کے طریقوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ عبادت چاہے جیسے مرضی کرلیں، اصل مقصود تو رضائے الٰہی کا حصول ہے ۔ اس لئے وہ عبادت کے طریقے اپنی مرضی سے بنا لیتے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا اللہ تعالیٰ اس طریقے سے خوش ہو جائے گا۔ کسی نے کہا، اس طریقے سے خوش ہو گا۔ یہی وہ مقام ہے سمجھنے کا کہ لوگوں نے عبادت کے الگ الگ طریقے کیوں بنا لئے ؟ صرف اسی وجہ سے کہ انہوں نے عبادت کو اپنی زندگی کا نصب العین یا اصل مقصد قرار نہیں دیا۔ اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول قرار دے دیا اور عبادت کو اس کا ذریعہ بنا لیا۔ حالانکہ عبادت اصل مقصود ہے اور رضائے الٰہی اس کا نتیجہ ہے۔

حقیقت بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عبادت کو اصل مقصود قرار دیا ہی نہیں۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور جماعتوں کے دستور و منشور ایسے موجود ہیں، جن میں سب سے پہلا جملہ ہی یہی لکھا ہوتا ہے کہ ہمارا مقصود یا ہمارا نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ بہت ساری باتیں انہوں نے اپنی طرف سے لکھی ہوتی ہیں۔ ان باتوں کے اثرات آگے چل کر منہج پر، عمل پر اور جماعتی زندگی پر بہت گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اور اگر منہج خراب ہو جائے تو اس کے بعد منزلیں کھو جاتی ہیں۔

کیا داڑھی میں اسلام نہیں؟

ہمارے ہاں جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ بھائی داڑھی رکھ لیں تو وہ عام طور پر یہ جواب دیتا ہے کہ بھائی داڑھی میں تو اسلام نہیں ہے ۔ اسلام میں داڑھی ہے۔ یعنی

اسلام میں بے شک داڑھی ہے، رکھنی چاہئے لیکن یہ سمجھ لینا کہ اب اس کے بغیر گزارہ نہیں تو ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں ۔ اسلام کوئی صرف داڑھی میں تو نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کو نماز کے بارے میں کہا جائے تو وہ بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ نماز نہ بھی پڑھیں تو کونسی بات ہے ۔ اسلام صرف نماز میں تو نہیں ہے ۔ کسی راشی کو کہا جائے کہ بھائی رشوت نہ لوتو وہ بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ اسلام صرف رشوت نہ لینے میں تو نہیں ہے۔ اسی طرح چور، ڈاکو، زانی، قاتل غرض جو جس برائی میں مبتلا ہو، یہی جواب دے کر جان چھڑا سکتا ہے ۔ کہ اسلام صرف اسی ایک برائی کے چھوڑ دینے میں تو نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت ہے، یہ کوئی فرضی بات نہیں، آجکل معاشرے میں عام طور پر ہر کوئی اپنی برائی کے بارے میں یہی خیال اور جواز رکھتا ہے اور کہتا بھی ہے۔ یا تو اپنے بڑے افسروں پر بات ٹال دی جاتی ہے کہ پہلے ان کا حساب تو کریں، وہ ہم سے زیادہ کرپشن کر رہے ہیں ۔ ان کی طرف تو کوئی دیکھتا نہیں ۔ اسی طرح ایک افسر اپنے سے بڑے افسر پر ڈال دیتا ہے ۔ بالآخر وہ اسے برائی سمجھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور اگر کوئی انہیں سمجھائے تو کہتے ہیں کیا اسلام سارا اسی برئی کے چھوڑنے میں ہے۔ کسی کو نماز کے بارے میں کہیں تو وہ بھی یہی کہتا ہے، کیا اسلام صرف نماز میں ہے۔ یہ سب باتیں عقیدے کی بہت بڑی بنیادی خرابی پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ ہم نے عبادت کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں۔ عبادت کو مقصود بنایا ہی نہیں۔ حالانکہ جن کاموں کا بھی اللہ نے حکم دیا ہے، داڑھی رکھنا یا نماز پڑھنا ہے تو یہ سب کام اللہ کی عبادت ہیں۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَ مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ))

'' اور نہیں تقرب حاصل کرتا میری طرف میرا بندہ مگر اس چیز کے ساتھ جو

مجھے بہت زیادہ محبوب ہے، ان چیزوں سے جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہے۔''

سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا بندہ اس چیز سے میرا تقرب حاصل کرسکتا ہے جو مجھے زیادہ محبوب ہو اور میں نے اس پر فرض قرار دے دی ہو۔

یہ حدیث قدسی ہے (یاد رہے کہ عام حدیث تو اسے کہتے ہیں جس میں راوی نبی ﷺ سے کوئی روایت کرتا ہے۔ جبکہ حدیث قدسی وہ ہوتی ہے، جس میں راوی نبی ﷺ سے بیان کرتا ہے اور نبی ﷺ اللہ سے روایت کرتے ہیں ۔یعنی نبی ﷺ خود بھی راوی بن جاتے ہیں۔کہا جا سکتا ہے کہ قرآن بھی نبی ﷺ نے اللہ سے روایت کیا ہے تو اس میں اور حدیث قدسی میں کیا فرق ہے تو یہ جاننا چاہئے کہ قرآن بھی بے شک نبی ﷺ نے اللہ سے ہی لیا ہے لیکن یہ اللہ کے اپنے الفاظ ہیں اور اس کا کلام ہے، جبکہ حدیث قدسی اللہ کا کلام نہیں ہوتا، اللہ کے کلام کا مفہوم ہوتا ہے۔ الفاظ نبی ﷺ کے اپنے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح عام حدیثوں میں ہمیں جب الفاظ کا کچھ اختلاف نظر آتا ہے تو بعض منکرِ حدیث یہ وہم ڈالتے ہیں کہ نبی ﷺ کے الفاظ مختلف کیسے ہو سکتے ہیں، اس لئے وہ حدیثوں کو مشکوک قرار دے دیتے ہیں حالانکہ حدیثیں بھی نبی ﷺ کے الفاظ کا مفہوم ہوتی ہیں۔ انہیں یہ غور کرنا چاہئے کہ الفاظ بے شک مختلف ہوں لیکن مفہوم تو ایک ہی ہے۔ احادیث کے لئے سند کا صحیح ہونا ضروری ہے ، اگر مفہوم ایک ہو تو صحابہؓ نبی ﷺ کی بات کو مختلف الفاظ کے ساتھ پہنچا سکتے ہیں ورنہ اس کے لئے سب حدیثوں میں ایک جیسے الفاظ کی پابندی لازمی نہیں۔ زیادہ تر دعاؤں والی احادیث میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ نبیؐ کے اصل الفاظ ہی کو بیان کیا جائے ۔ دیگر احادیث میں عموماً یہ اہتمام نہ کیا گیا ہے نہ ضروری ہے۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادت وہ تمام چیزیں ہیں، جو اللہ کو محبوب ہیں۔ اللہ نے ان کو عبادت بنا کر اپنے بندے پر فرض قرار دیا ہے۔ اور بتا دیا کہ اب انہی چیزوں کے ساتھ عبادت ہوگی۔ ان چیزوں کا تعلق صرف نماز روزہ جیسے چند احکام تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسان کی انفرادی زندگی سے اجتماعی زندگی تک، اخلاق و معاملات سے لے کر نکاح، طلاق، سیاست، تجارت غرض سب کچھ اس میں شامل ہے، اوران میں چاہے چھوٹی چیزیں ہوں یا بڑی، جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان سب کا بجا لانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ عبادت ہیں اور ہمارے اوپر فرض ہیں اور انہی سے اللہ کا تقرب حاصل ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص داڑھی نہ رکھنے کو اپنی کوتاہی اور غلطی کہے اور اس کا ایمان ہو کہ داڑھی اسے ضرور رکھنی چاہئے اور یہ کہے کہ میں ان شاء اللہ ضرور رکھوں گا، تو یہ اور بات ہے لیکن اگر آدمی داڑھی کو غیر ضروری کہے اور یہ کہے کہ داڑھی میں کونسا اسلام ہے، تو یہ سراسر عقیدے کی بڑی خرابی ہے۔ جب ایک چیز اللہ کی طرف سے مقرر کردی گئی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کو محبوب ہے، اور انہی چیزوں کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہوسکتا ہے، جو اللہ کو محبوب ہوں اور انہی چیزوں کے ذریعے اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ جملہ سراسر گمراہی پر مبنی ہے کہ داڑھی میں اسلام نہیں۔ اسلام میں ہر اس چیز کی اہمیت ہے، جس کا اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے حکم دے دیا، اس لئے کہ یہ سب کچھ اللہ کی عبادت میں داخل ہے۔

اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟

یہ واضح ہوجانے کے بعد کہ اللہ کی عبادت سے مراد انسان کے وہ تمام اقوال و افعال ہیں، جن سے اللہ راضی ہوجائے اور یہ کہ نماز، روزہ اور چند اذکار ہی عبادت نہیں بلکہ اس میں سونے جاگنے سے لے کر سیاست ومعیشت اور تمام باہمی معاملات بھی شامل ہیں اور عبادت ہی ہمارا اصلی مقصد ہے۔ تو اب فطری طور پر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟ اس کا طریقہ کیا ہے کیونکہ کوئی عمل طریقے کے بغیر ممکن نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے ہم عبادت میں کسی خاص طریقے کے پابند ہیں یا اپنی مرضی سے طریقہ اختیار کرسکتے ہیں؟ یا جہاں سے بھی جو طریقہ اچھا لگے لے سکتے ہیں؟ ہر مذہب میں لوگوں نے اللہ کی عبادت کے لئے اپنے اپنے طریقے بنائے ہوئے ہیں۔ جس نے جو طریقہ پسند کیا اسے عبادت کے لئے اپنا لیا۔ حالانکہ پسند اللہ کی چلنی چاہئے۔

صوفیاء میں عبادت کے مختلف طریقے:

صوفیاء میں خاص طور پر عبادت کے لئے بہت سے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ کسی نے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ سانس روک کر ذکر کریں اور پھر کہتے ہیں کہ سانس ایسے نکالیں کہ تمہاری زبان ذکر نہ کرے، تمہارے منہ اور زبان سے آواز نہ نکلے بلکہ تمہارے دل سے آواز نکلے۔ تم جتنا اپنے دل کو چالو کرتے جاؤ گے، اتنا اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوتا چلا جائے گا۔ اسی طرح ایک نقشبندی طریقہ ہے، اس سلسلے کے لوگ اپنے سامنے ایک نقش بنا کر رکھ لیتے ہیں، اس پر ضربیں لگانا شروع کردیتے ہیں اور پھر وہ دل پر ضربیں لگالگا کر اپنے تئیں اللہ کا لفظ

دل پر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوراس کے اندر سے وہ اللہ اللہ کی آواز بھی نکالنے کی مشق کرتے ہیں۔

اس طرح کے مختلف طریقے صوفیاء نے اور دیگر لوگوں نے اپنی اپنی طرف سے بنائے ہوئے ہیں اور وہ انہی طریقوں کو ہی اللہ کی عبادت سمجھتے ہیں۔ان کی ساری محنت انہی طریقوں کو اپنانے پر ہی مسلسل جاری رہتی ہے۔ان کے نزدیک نماز، روزہ وغیرہ سب ظاہری عبادتیں ہیں ۔اصل عبادات ان کے اپنے بنائے ہوئے طریقے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ظاہری اعمال یعنی نماز اور روزے کی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں ۔ظاہری نماز کی اہمیت نہیں۔

نماز، روزہ اور اقامت دین:

اس طرح کی سنگین غلطی صوفیاء سے قدرے قریب ایک مذہبی حلقے میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ اقامت دین کواپنا مقصد قرار دیا ہے۔وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو اقامت دین کے لئے ایک تیاری قرار دیتے ہیں۔ نماز سے بھی ان کے نزدیک اقامت دین کے اصل مقصد کے لئے تیاری ہوتی ہے۔روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ سے بھی تیاری کا ہی کام ہوتا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ان کے ہاں اصل عبادت یا مقصد نہیں۔اصل مقصد اور مقام ان کے ہاں اقامت دین کو حاصل ہے ۔ان کے نزدیک اگر اقامت دین پیش نظر نہیں تو نماز، روزہ وغیرہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔

جہاں تک اقامت دین کا تعلق ہے تو اس کے لئے محنت اسلام میں بنیادی عمل اور عظیم فریضہ ہے۔اس کے لئے اخلاص کے ساتھ کی جانے والی ہر محنت عظیم عبادت

ہے لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں کہ اقامت دین ہی اصل عبادت ہے اور نماز اور روزے کو صرف تیاری قرار دیا جائے جب کہ نبی ﷺ نے نماز اور روزے کو اسلام کا رکن قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ان ارکان کو قائم کرنا اسلام قائم کرنا ہے۔ گویا کہ جو شخص نماز اور روزے کو قائم کرے گا..... وہی دین کو قائم کرے گا۔ لیکن احباب گرامی سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے اصل مقصد حکومت کا قیام سمجھ لیا اور اسی ایک مقصد کے لئے محنت شروع کردی۔ ان کے ہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔ جیسے کوئی پڑھ لے ان کے نزدیک سب طریقے درست ہیں۔ اصل اہمیت اقامت دین یعنی حکومت کے قیام کی ہے۔ پھر اسی طرح یہ غلطی بھی نمایاں ہوئی ہے کہ وہ حکومت کے قیام کے لئے ہر طریقے کو ہی جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمہوریت اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں اگر مقصد اقامت دین ہو۔ ہم کہتے ہیں یہ منہجی غلطی ہے۔ ظاہر ہے غلبۂ دین یا اقامت دین کی خاطر نبی ﷺ اور ان کے خلفاء کا ہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ غیر اسلامی طریقے اختیار کرکے کبھی اقامت دین کا کام نہیں ہوا۔ اگر کسی اسلام پسند کو جمہوری طریقے سے حکومت مل بھی گئی تو اقامت دین کے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایسی موجودہ دور کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے واضح ہیں۔ اس منہجی غلطی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلام پسند معیشت اور سیاست کو عبادت نہیں مانتے بلکہ دنیاوی ضرورت سمجھتے ہیں، لہٰذا نفع کمانے اور حکومت حاصل کرنے کے ہر طریقے کو درست سمجھ لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوچ بھی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی معیشت و سیاست کو اللہ کی عبادت ہونا چاہئے اور ہر عبادت کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا بتایا ہوا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ جو بھی دین میں عبادت کے لئے اپنے بنائے ہوئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں اختلافات بڑھتے جاتے ہیں ۔ ذہن مختلف ہوتے جاتے ہیں اور جو اللہ کے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے ہیں وہ عموماً چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔

جہاں تک ''اللہ کی عبادت ہمارا اصل مقصد ہے'' کا تعلق ہے ۔ تو اس کو پھر بھی بہت سے لوگ مان لیتے ہیں ۔لیکن زیادہ اختلاف اور بگاڑ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے ؟وہ کونسا طریقہ ہے کہ جس کے تحت ہماری سیاست، ہماری معیشت ، ہماری تجارت، ہماری معاشرت، ہمارے حقوق و فرائض کا پورا نظام، اللہ کی عبادت بن جائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی عبادت اس طریقے سے کریں جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے۔

اس کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جس کام کا حکم دیا ہے،اس کی پیروی کی جائے بلکہ اس کام کو انجام دینے کے لئے اللہ اور رسول ﷺ نے جوطریقہ بتایاہے، اس کی پیروی بھی ضروری ہے ۔ یعنی جس طرح احکام اللہ کی طرف سے ہیں، اس طرح احکام پر عمل کرنے کے طریقے بھی اللہ کی طرف سے ہیں۔ جس طرح نماز پڑھنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا طریقہ بھی اللہ کی طرف سے ہے ۔ روزہ رکھنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہے تو روزہ رکھنے کا طریقہ بھی اللہ کی طرف سے ہے۔گویا ہر کام کا طریقہ اسلام میں شامل ہے۔

سنت کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کیوں؟

اللہ نے انبیاء کو مبعوث ہی اس لئے کیا تاکہ وہ لوگوں کو عمل کرنے کے طریقے بتائیں۔ مطلقاً احکام پہنچا دیناہی ان کے ذمے نہیں تھا بلکہ ان احکام کی مراد اور ان پر

عمل پیرا ہونے کا طریقہ بتانا بھی ان کے فرائض میں شامل اور اگر انبیاء یہ کام نہ کرتے تو ہر ایک حکم سے کوئی کیا مراد لیتا اور کوئی کیا۔ ایک ہی حکم پر کوئی ایک طریقے سے عمل پیرا ہوتا تو دوسرا کسی اور طریقے پر اور تیسرا کسی اور طریقے پر، تو اس طرح احکام پر عمل کے طریقوں میں شدید اختلاف پیدا ہو جاتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقے اسی بنیاد پر بنے ہیں۔ شریعت کی طرف سے اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اللہ تعالیٰ نے جو بھی حکم نازل کیا ہے ،اس کا مقصد اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بتایا ہے۔ نبی ﷺ کے سوا دنیا میں کوئی بھی اس مقصد کو جاننے کا ذریعہ نہیں۔ گویا طریقے کی ساری بحث نبی ﷺ سے متعلق ہے۔

سنت کا معنی طریقہ ہے ۔ ہر عمل کا طریقہ جو اللہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اسے اختیار کریں۔ وہ نبی ﷺ بتاتے ہیں کیونکہ اللہ حکم دیتا ہے، عمل نہیں کرتا۔ اللہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ نبی کے عمل اور طریقے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی مراد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ﴿اقیموا الصلواۃ﴾ تو عربی لغت صلوۃ کے معنی مطلق معنی حرکات وسکنات ہے۔ مختلف حرکات کرنا ایک ہی حالت میں نہ رہنا بلکہ حالتوں کو بدلتے رہنا، اسے لغت میں صلوٰۃ کہا گیا ہے ۔ اب اگر صلوٰۃ کے طریقے کے لئے نبی ﷺ سے رجوع نہ کیا جائے اور صلوٰۃ کا اپنا مفہوم نکالنے کی کوشش کی جائے اور اس پر عمل کا طریقہ اختیا کیا جائے تو سوائے اختلاف اور انتشار کے کوئی چیز ہاتھ نہ آئے گی۔ اگر عقیدہ یہ رکھا جائے کہ نبی ﷺ کو اللہ نے جہاں نماز کا حکم دیا، وہاں نماز کا طریقہ سمجھانے کے لئے بھی جبریل کو بھیجا تھا اور جبریل نے نماز پڑھ کر دکھائی تھی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی اور اسی طریقے پر پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے امت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا اور سب ایک صحیح طریقے پر عمل کریں

گے۔ اسی طرح سیاست، حکومت اور دیگر امور ہیں۔ گویا کہ ہماری عبادت تب اللہ کی صحیح عبادت ہوگی جب ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکام اور طریقوں کے مطابق عمل کریں گے۔ لیکن اپنی پسند سے جو بھی کوئی طریقے نکالے گا، وہ ہرگز صحیح عبادت نہ ہوگی۔ کوئی شخص اگر یہ کہے کہ دو ٹانگوں پر قیام کر لینا کون سی بڑی عبادت ہے، میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر قیام کروں گا تو یہ ہرگز اللہ کی صحیح عبادت نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح بعض لوگ سخت سردی کی راتوں میں یخ بستہ ٹھنڈے پانی میں کھڑے ہوکر عبادت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض لوگ چپ کا روزہ رکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ عبادت ہے۔ کہیں کوئی اپنے اوپر ایک مدت کے لئے چولہے کی پکی ہوئی چیزیں کھانا حرام کر لیتا ہے۔ یہ طریقے ہندوؤں، سادھوؤں اور ہمارے ہاں بعض صوفیوں میں بھی رائج چلے آرہے ہیں۔ وہ اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ مشقتیں ڈال کر اپنے تئیں عبادت کا ایک سخت اور پختہ دورہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے اوپر جس قدر زیادہ مشقتیں ڈالیں گے، اسی قدر ہمارا ریاض، ہمارا گیان دھیان اور ہماری عبادت زیادہ مقبول اور زیادہ موثر نتائج کی حامل ہوگی اور ہم سلوک کی منازل جلد طے کر لیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو ایک ٹانگ، پر کھڑے ہوکر عبادت کرتا ہے وہ عقیدے کی خرابی میں مبتلا ہے۔ اس کی رہنمائی شیطان کر رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے طریقے نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ اپنی طرف سے عبادت کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا بدعت ہے۔ یہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا:

﴿ يَآ اَيُّهَالَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ ﴾ [الحجرات]

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے مت بڑھو۔''

﴿ یٰۤاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُو اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ ﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔‘‘

گویا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں عمل ہوگا تو عبادت ہوگی۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں عمل نہ ہوگا، وہ باطل اور برباد ہوگا۔اس کا اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ہوگا بلکہ قیامت کے دن ایسے اعمال پر عذاب ہوگا۔انسان چاہے کتنا ہی اچھے سے اچھا اور خوبصورت عمل کرے۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں نہ ہوگا تو وہ باطل ہی ہوگا۔کوئی چاہے بے بہا صدقہ وخیرات کرے، لمبی لمبی نمازیں پڑھے، ساری ساری رات رکوع وسجود کرے لیکن اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کی عبادت نہیں تو وہ ضائع ہی ہوگی۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ تین آدمی رسول اللہ ﷺ کے گھر آئے آپؐ کی عبادت کے متعلق پوچھا۔ جب انہیں بتایا گیا تو گویا انہوں نے اسے کم سمجھا کہنے لگے۔ ہماری رسول ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ کے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک نے کہا ، میں ہمیشہ رات کو نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا ، میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔آپؐ کو اطلاع ہوئی تو ان سے فرمایا،تم لوگوں نے یہ باتیں کہیں ہیں؟

یاد رکھو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور روزہ افطار بھی کرتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جو شخص

میرے طریقے سے بے رغبتی کرے، وہ مجھ سے نہیں۔ (متفق علیہ)

بھائیو! یہ بہت بڑی کسوٹی ہے حق و باطل کو پہچاننے کی ۔ آپ کسی کو قبر میں چلہ کاٹتے یا ایسا کوئی کام کرتے دیکھو تو پوچھو کہ کیا تم نبی ﷺ سے زیادہ متقی ہو؟ اور ان سے کیا زیادہ عبادت گزار ہو؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ہر عمل کا جو طریقہ سمجھایا ہے۔ وہی امت کے لئے صحیح ہے۔ کتب حدیث کا بغور مطالعہ کریں تو محدثین کرام نے عظیم خدمات انجام دے کر نبی اکرم ﷺ کے شب و روز کو اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ وہ امت کے لئے واضح اور مکمل لائحہ عمل ہے۔اس میں عبادت سے لے کر معاملات اور سیاست و تجارت کے سب ابواب امت کے لئے قیامت تک راہنمائی ہیں۔بعض لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ یہ باتیں بہت پہلے کی ہیں، زمانہ اور حالات کے بدلنے سے سب چیزیں قابل عمل نہیں رہیں البتہ بعض چیزوں کو اب بھی وہ عمل کے لئے درست سمجھتے ہیں خصوصاً سیاسیات و سماجیات کو وہ الگ کر کے رائے زنی کرتے ہیں۔ سیاست و حکومت کو دین سے الگ کر کے سے دنیا کا کھیل بناتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے سیاست و حکومت کے امور انجام دیئے ہیں اور پھر جماعت صحابہ و خلفاء نے ان امور کو نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر انجام دیا ہے، کتب حدیث میں پورا ذخیرہ بطور راہنمائی موجود ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس دور میں ہیں، جب کفر کا غلبہ ہے ۔مسلمانوں کو غیر اسلامی نظاموں کے تحت رہنا پڑ رہا ہے ۔ایسے دور میں ہم راہنمائی کہاں سے لیں۔ تو ہم یہ کہتے ہیں ،کیا انبیاء کے ادوار میں ایسے حالات نہیں تھے۔ انہوں نے غیر اسلامی نظاموں اور حکومتوں کے تحت زندگیاں بسر نہیں کیں اور کیا خاتم النبیین ﷺ پر ایسا دور نہیں آیا جب آپ کے پاس حکومت نہیں تھی اور کفر و شرک پھیلا ہوا تھا۔ پھر مکہ سے

ہجرت کرنے کے بعد مدینہ میں پہنچ کر بھی نبی ﷺ کو یہود و منافقین کی ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا۔ آپ ﷺ نے افرادی قوت وسائل کو کیسے بڑھایا؟ مدینہ پر کیسے کنٹرول کیا؟ گردوپیش میں کیسے پہنچے؟ نظام کو کیسے ہاتھ میں لیا؟ وہ طریقہ کیا تھا؟ کون کہتا ہے کہ ہمیں نبی ﷺ سے اس سلسلے میں پوری راہنمائی نہیں ملتی۔ ایسے شخص کے عقیدے میں غلطی ہے اور یہیں سے منہج کی خرابیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ اور منہج کی خرابی سے منزلیں کھو جاتی ہیں اور محنتیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ اللہ محفوظ رکھے اور توفیق سے نوازے۔

عام لوگوں میں اجتماعی اور حکومتی امور میں منہج کی خرابی کی بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ سیاست و معیشت کو دین اور عبادت کے طریقوں میں شامل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں ہر شعبہ ہائے حیات میں مکمل رہنمائی دی ہے کہ جس پر چل کر ہماری سیاست و معیشت بھی اللہ کی عبادت میں داخل ہوجاتی ہے۔

شریعت کے مطابق حکومت کرنا بھی عبادت ہے:

ہمارے ہاں ایک بڑا سوال ٹھایا جاتا ہے کہ ملک میں شریعت کیسے نافذ ہوسکتی ہے اور اسکا طریقہ کار کیا ہے؟ خود ہمارے حکمران بھی یہ سوال اٹھاتے رہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہم شریعت کیسے نافذ کرسکتے ہیں؟ اس کا ہمیں طریقہ کار بتاؤ۔ اس سوال کو ہم بڑا مشکل سا سمجھتے ہیں اور اسکے جواب میں ہمارے بڑے بڑے علماء اور اسلام پسند دانشور بھی بڑا پیچیدہ سا انداز اختیار کرلیتے ہیں۔ دور از کار باتوں، فلسفوں اور ایسی بھول بھلیوں میں پڑ جاتے ہیں کہ اصل راہ ہی گم ہوجاتی ہے اور سوال کا جواب سوال

سے بھی مشکل ہوجاتا ہے حالانکہ یہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ کیا نبی ﷺ نے شریعت نافذ کی تھی یا نہیں؟ سب مانتے ہیں نبی نے شریعت نافذ کی تھی، پھر اگر کی تھی تو کیسے کی تھی، اس کا جواب بھی بآسانی مل سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک طریقہ کار سے لاعلمی اصل مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران شریعت کے قیام کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے اور نہ ہی وہ حکومتی امور کو عبادت میں شامل سمجھتے ہیں ۔ انہیں دراصل یہی احساس دلانے اور بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ ایک مسلمان حکمران ہیں۔ دین کا قیام ان کا بنیادی کام ہے۔ ہر شعبے اور ہر معاملے میں نبی ﷺ کی پیروی ان پر فرض ہے ۔ اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق حکومت کرنا بھی عبادت میں شامل ہے ۔اگر ایک مسلمان حکمران عقیدہ وعمل کے اعتبار سے ایسا پختہ ہوجائے اور وہ ایک بار طے کرلے کہ اس نے اللہ کے دین کے قیام کا ہی کام کرنا ہے تو اس کے لئے طریقہ کار وغیرہ کی کوئی مشکل نہیں رہے گی اور نہ کوئی اور مسئلہ ان شاء اللہ رکاوٹ بن سکے گا۔لیکن یہ کام تب ہی ہوسکتا ہے جب وہ جان لے کہ جو آدمی حکمران بنتا ہے، وہ نبی ﷺ کا نائب بنتا ہے اور اس نے وہی کام کرنے ہیں جو نبی ﷺ نے بتائے ہیں بلکہ اسی طرح کہ جیسے جو آدمی مصلے پر کھڑا ہوکر نماز پڑھاتا ہے، وہ نبی کا نائب بن کر نماز پڑھاتا ہے۔ اور نماز اس طرح پڑھائے گا، جیسے نبی ﷺ نے پڑھائی۔ اپنی مرضی اور طریقے سے نماز نہیں پڑھا سکتا۔ اگر وہ کوئی غلطی کرتا ہے تو پیچھے سے مقتدی سبحان اللہ کہتا ہے یعنی اس پر پیچھے والے واضح کردیتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ یہ نبی ﷺ کا طریقہ نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اصل امام نبی ﷺ ہے۔ تم اس کے نائب ہو۔ غلطی کروگے تو پیچھے سے اصلاح کریں گے۔ حاکم وقت کی پوزیشن بھی یہی ہوتی ہے جو مسجد کے امام کی ہوتی ہے۔حکمران بھی حکومت کی نشست

پر اللہ کے نبی ﷺ کا نائب اور مسئول بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ اپنی مرضی کرنے کا مختار نہیں ہوتا۔ جیسے مسجد کے امام کو نبی ﷺ کا طریقہ اپنانا ضروری ہے، ایسے ہی حکمران کیلئے بھی آپ ﷺ کے طریقہ کی اتباع لازمی ہے۔ تب ہی وہ مسلمان حاکم بنے گا اور یہی اس کا امتحان ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ سیاسی نظام انگلینڈ کا بہتر ہے، معاشی نظام جاپان سے لے لینا چاہئے اور اسی طرح تعلیم وغیرہ کے لئے کسی اور مغربی ملک کے نظام کو بہتر سمجھے اور یہ خیال کرے کہ انہی ملکوں کا نظام اپنانے سے ترقی ہوسکتی ہے تو یہ صریح گمراہی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بغاوت ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہم اللہ کے نبی ﷺ کی پیروی کے پابند ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے شریعت کو نافذ کیا اور مکمل طور رنافذ کیا۔ حکمران کو بھی نبی ﷺ کے نائب ہونے کی حیثیت سے یہی کام کرنا ہے۔ وہ ایک بار اپنی یہ ذمہ داری جان لے' طریقہ بھی نبی ﷺ کا اختیار کر لے تو ابھی شریعت نافذ ہوجائے گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے حکمران اپنی اس بنیادی ذمہ داری کو شرح صدر سے سمجھتے ہی نہیں وہ اگر سمجھتے بھی ہیں تو خود کو نبی کا نائب سمجھنے کی بجائے اللہ کا نائب اور خلیفہ سمجھنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اللہ کا نائب اور اللہ کا خلفیہ کوئی نہیں بن سکتا۔ لیکن نفاذ شریعت کے معاملے میں پھر بھی پہلو تہی کرتے یا کہہ دیتے ہیں کہ ہم بے بس ہیں اور ہمارے لئے شریعت کا مکمل نفاذ ممکن نہیں۔

سوچئے انسان حاکم بھی ہو، حکومتی سہولتوں اور لذتوں سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھائے لیکن اخروی طور پر انسانوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھاتا چلا جائے، کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ واللہ! جتنے انسان ملک میں رہتے ہیں، ہر بندے کی نماز کا حساب حاکم نے دینا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ ﴾ [الحج : ۴۱/۲۲]

''جن کو ہم نے زمین میں اقتدار دیا ہے' ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز کو قائم کریں۔''

اگر حاکم یہ کام نہیں کرتا' لوگ نماز نہیں پڑھتے تو مجرم حاکم ہوگا۔ لیکن ہمارے حکمران اسے کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔ یہ سب عقیدے کی خرابیاں ہیں اور آخرت کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر عقیدے میں پختگی ہو اور اس بات کا شعور ہو کہ اللہ کی شریعت کے مطابق حکومت کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے اور یہ اللہ کی عبادت کا ایک بڑا اہم طریقہ اور ذریعہ ہے تو سب بگاڑ اور الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ حکمران یہ سمجھے کہ اللہ نے اس طریقے سے مجھے اپنی عبادت کا موقع دیا ہے جو دوسروں کو نہیں دیا بلکہ اس طرح میرے اوپر سخت امتحان آن پڑا ہے تو پھر اس امتحان سے سرخرو ہونے والوں کے لئے اللہ نے درجات بھی بہت اونچے رکھے ہیں۔ نبی ﷺ نے جن سات لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت کی سخت گرمی اور نفسانفسی کے دن جب زمین پگھل رہی ہوگی اور تانبے کی ہو رہی ہو گی اور سوائے اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اس دن انہیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا، تو ان میں ایک حاکم عادل بھی ہوگا۔ لیکن جس قدر درجہ بلند ہے، آزمائش اور پریشانی بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ جواب دہی بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔

غرض حکمران شریعت کے نفاذ کے لئے پہلے یہ ذہن' عقیدہ اور منہج اختیار کریں تو آگے سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ لوگوں کے اندر بھی غلبۂ دین اور اس کے طریقہ کے بارے میں جو الجھنیں ہیں، وہ بھی اسی طرح رفع ہوں گی کہ ہم پہلے اپنا عقیدہ و منہج درست کریں اور ہر شعبے اور ہر معاملے میں نبی ﷺ کے طریقہ کی طرف

دیکھتے چلے جائیں تو کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ غلبۂ دین یا کسی اور مسئلے کے بارے میں جو طریقہ اور معیار اس کے ذہن میں ہے اور جو حل اس کے پاس ہے، اگر دوسرا بھی یہی طریقہ اور یہی حل اس کے سامنے رکھے تو تب تو درست ہے ورنہ وہ اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ طریقہ ہمارا چلے گا نہ تمہارا نہ کسی اور کا۔ طریقہ تو صرف رسول اللہ ﷺ کا چلے گا۔ ہم دراصل اپنے ذہنوں کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنے آپ کو اللہ کی شریعت کے تابع نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں یہ سمجھنا اور ماننا ہوگا کہ عام عبادات نماز، روزہ، حج وغیرہ کے طریقے ہوں یا سیاسی اور حکومتی امور، سب میں طریقہ وہی چلے گا جو اللہ نے بتادیا اور رسول ﷺ نے عمل کرکے دکھا دیا۔

﴿ كَمَا اَمَرَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

وہی عمل درست ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہیں اور جو ان کے خلاف ہیں، ان کے بارے میں متنبہ کردیا گیا:

﴿ وَ لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ ﴾ ''اپنے اعمال برباد نہ کرو۔''

ایسے اعمال قیامت کے دن نہ ترازو میں تلیں گے اور نہ دنیا میں ان طریقوں سے کوئی فائدہ ہوگا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ »(مسلم)

''جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔''

اس حدیث کے الفاظ میں بہت بڑا نکتہ ہے۔ یہاں صرف مَنْ عَمِلَ (جس نے کوئی عمل کیا) بھی کہا جا سکتا تھا لیکن فرمایا گیا مَنْ عَمِلَ عَمَلاً۔ یہاں عَمِلاً کے آخر میں تنوین (ً) ہے۔ اور جہاں تنوین آئے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی چھوٹے

سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا عمل ۔تنوین دونوں قسم کے اعمال کو محیط ہوتی ہے۔

گو یا اب مذکورہ بالا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی بڑا یا چھوٹا عمل جو ہمارے حکم یا ہمارے طریقے کے مطابق نہیں، وہ مردود ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں ہے۔ نہ دنیا کے اندر ایسے اعمال میں اللہ برکت دے گا اور نہ آخرت میں ان کا کوئی وزن ہوگا۔

اس سلسلے میں ایسے اعمال کی بہت سی مثالیں ہیں کہ جنہیں بظاہر لوگوں نے بڑے نیک اعمال بنایا ہوا ہے لیکن حقیقتاً اللہ کے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ وہ ایسے مبتدعیانہ اور مشرکانہ اعمال ہوتے ہیں، جو اللہ کی سخت ناراضگی اور غیض وغضب کا باعث ہوتے ہیں۔مثلاً درباروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، کالے بکروں کا صدقہ کیا جاتا ہے، غیر اللہ کے نام کی منتیں مانی جاتی ہیں۔ یہ سب چیزیں صریح شرک کے زمرے میں آتی ہیں۔ ایسے اعمال چاہے کتنا ہی اچھا نکتۂ نظر رکھ کر انجام دیئے جائیں لیکن چونکہ ان پر اللہ اور رسول ﷺ کی مہر نہیں ہوتی ' اس لئے باطل اور مردود ہیں ۔

اسلام نافذ کرنے کیلئے الیکشن کے طریقے کی شرعی حیثیت:

اسی طرح سیاسی میدان کی بدعات اور خرافات ہیں۔ جمہوریت اور اکثریت کی بنیاد پر فیصلے کرنا اور قانون سازی کرنا بھی اسلام میں شرک ہے ۔لیکن ہمارے ہاں بعض اسلام پسند کہلانے والے لوگ الیکشن میں یہ کہہ کر حصہ لیتے ہیں کہ ہم منتخب ہو کر اسلام نافذ کر لیں گے۔ حالانکہ ان سے پوچھنا چاہئے کہ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسلام کے نفاذ کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے ۔کیا آپ ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے پہلے لوگوں سے پوچھا جائے کہ تمہیں اللہ کا

دین چاہئے یا نہیں۔ اگر اکثریت چاہے تو نافذ کردیا جائے ورنہ نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھٹو دور میں اس جمہوری نظام کی وجہ سے خوفناک صورتحال پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں سے یہ پوچھا جانے لگا کہ تمہیں اسلام چاہئے یا سوشلزم۔ لوگوں نے سوشلزم کے علمبردار بھٹو کو ووٹ دے دیئے تو گویا یہ تاثر پیدا ہوا کہ اسلام کو مسترد کردیا گیا۔ حالانکہ اسلام کو الیکشنوں میں گھسیٹنا اور اسے ووٹ کا محتاج بنانا ہی غلط ہے۔ یہ طریقہ تو لوگوں کے عقائد اور دین سے کھیلنے والی بات ہے۔ اگر اسلام کے نفاذ کے لئے الیکشنوں کے جمہوری نظام کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اگر اسلام کو لوگ ووٹ دے دیں تو اسلام درست ہے ورنہ کسی دوسرے نظام کو ووٹ دیں تو وہ نظام درست ہوگا۔ اسلام معاذ اللہ درست اور برحق نہ ہوگا۔ حالانکہ لوگ اسلام کو ووٹ دیں یا نہ دیں، اسلام ہی ہرصورت درست اور برحق ہے اور دوسرا ہر نظام باطل ہے۔ اسلام لوگوں کے ووٹ اور ان کی اکثریت کی پسند نا پسند کا محتاج نہیں۔ اللہ نے اسلام کو لوگوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا۔

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○﴾ [الجاثیه : ۱۸/۴۵]

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے نبی، ہم نے آپ کو شریعت دی ہے۔ آپ ﷺ اس کی اتباع کریں اور ان لوگوں کی آراء اور خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جنہیں دین کا پتہ ہی نہیں۔“

یعنی اللہ نے واضح کردیا کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ اگر لوگ اللہ کا حکم مانیں، تب وہ درست ہوگا، بلکہ لوگ مانیں تب بھی اللہ کا حکم درست ہے اور نہ مانیں تب بھی اللہ کا حکم ہی درست ہے۔

غلبۂ اسلام کا طریقہ جہاد ہے:

جہاد جیسی عظیم عبادت بھی اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق کرنے سے قبول ہوگی۔ اللہ نے کافروں پر اسلام کے غلبے کے لئے جہاد کا طریقہ کار مقرر کیا ہے۔ اگر یہ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام و فرامین اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطابق ہوگا تو اللہ کے ہاں قبول ہوگا وگرنہ یہ عمل بھی مردود ہوگا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب جہاد ی لشکر روانہ فرماتے تو کمانڈر کو یہی تلقین کرتے کہ وہ کفار پر حملہ سے پہلے انہیں اسلام اور توحید کی دعوت دیں ۔ اگر وہ یہ دعوت قبول کرلیں تو پھر ان سے کوئی لڑائی نہیں ہوگی ۔ وہ ہمارے بھائی ہوں گے لیکن اگر وہ یہ دعوت قبول نہ کریں تو ان پر اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے کوئی جبر نہ ہوگا ۔ کیونکہ اسلام میں یہ ہرگز جائز نہیں کہ کافروں کی گردن پر تلوار رکھ کر انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ البتہ ان پر حکومت اللہ کے دین اسلام اور مسلمانوں کی ہوگی اور انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کے عوض اسلامی ریاست کو جزیہ کی صورت میں ایک معمولی ٹیکس دینا ہوگا۔ اگر وہ جزیہ بھی نہ دیں تو پھر فرمایا کہ اب تلوار ہی ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گی ۔ اب ان کی پسند نا پسند نہیں چلے گی ۔ گویا اسلام نے کافروں پر غلبے کے لئے یہ راستے بتائے ہیں کہ پہلے انہیں دعوت دی جائے۔ اگر وہ قبول نہ کریں اور جزیہ دے دیں' تو انہیں پھر بھی امان ہے۔ البتہ اسلام کی حکومت کا ان پر غلبہ ہوگا لیکن اگر وہ جزیہ بھی نہ دیں تو تب تلوار اور جہاد کے ذریعے اسلام ان پر غالب کیا جائے گا۔

جہاد سے پہلے کافروں کو دعوت دینے کا مسئلہ:

یہاں پر بعض لوگ ایک شبہ پیدا کرتے ہیں کہ جب جہاد کے لئے پہلے کافروں کو

دعوت دینا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج آپ جہاد کرنے سے پہلے کافروں کو دعوت دینے کا اہتمام نہیں کرتے تو ان بھائیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ کشمیر کا جہاد دفاعی نوعیت کا جہاد ہے ۔ یہ ہجومی اور اقدامی جہاد نہیں یعنی جب مسلمان خود کافروں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ ہجومی جنگ ہوتی ہے۔ ایسے جہاد میں طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ کافروں کو دعوت دے کر پہلے اتمام حجت کیا جائے۔ اگر وہ نہ مانیں تو تب ان سے جزیہ لیا جائے گا اور جزیہ بھی نہ دیں تو تب تلوار کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن جب مسلمان خود حملہ آور نہ ہوں بلکہ ان پر ظلم وستم ڈھایا جا رہا ہو' ان کی عصمتیں لٹ رہی ہوں، ان کی زمینوں پر کافر قابض ہوں اور کافران کا ہر لحاظ سے استحصال کر رہے ہوں' وہ بے چارے اپنی جان و مال اور عزتیں بچانے کیلئے دفاع پر مجبور ہوں تو ایسی حالت میں جہاد کا یہ طریقہ کار نہیں کہ پہلے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور نہ ماننے پر پھر جہاد کیا جائے بلکہ اس صورت میں صرف اپنے دفاع کا حکم ہے کیونکہ یہاں جنگ کافروں نے مسلط کی ہے۔ ظلم انہوں نے کیا ہے۔ حقیقت بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں آج جہاں جہاں جہاد ہو رہا ہے تو ہر جگہ مسلمان مظلومیت کی کیفیت میں ہیں۔ یہاں اقدامی اور ہجومی جنگ و جہاد والی شرطیں چل ہی نہیں سکتیں کہ پہلے یہ مظلوم مسلمان دعوت دیں اور مکمل اتمام حجت کے بعد پھر اپنا بچاؤ شروع کریں۔ کیا کسی کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ڈاکو اور بدمعاش کسی کی مال وجان اور عزت کے درپے ہوں اور وہ اپنے فوری بچاؤ کی تدبیر کرنے کی بجائے اسے اخلاقی لیکچر دینے میں مشغول ہوجائے۔ یہ نہ عقل مانتی ہے اور نہ ہی یہ بات سیرت نبوی ﷺ سے ثابت ہے ۔ آپ نبی ﷺ کے ابتدائی غزوات اور دفاعی جنگیں ملاحظہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے ان جنگوں میں کہیں بھی یہ طریقہ

اختیار نہیں کیا کہ پہلے کافروں کو دعوت دی ہو اور پھر ساری حجت پوری کرنے کے بعد کافروں کے خلاف تلوار اٹھائی ہو۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد ، یا غزوۂ احزاب ہو، کہیں بھی آپ ﷺ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے کافروں کو دعوت نہیں دی ۔ غزوہ احزاب میں تو یہ صورت حال تھی کہ مسلمانوں نے خندقیں کھودی ہوئی تھیں ،محصور ہو چکے تھے اور سخت پریشانی کا عالم تھا، کافر مسلمانوں کے گھر لوٹنے اور ان کی جان و مال اورعزتوں کے لٹیرے بن کر بڑی تیاری کے ساتھ حملہ آور تھے۔ کیا کوئی ایک بھی حدیث دکھا سکتا ہے کہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے ایسے موقع پر کافروں کو پہلے دعوت دی ہو۔اس طرح کی صورتحال میں تو ایسا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ دفاع میں دعوت نہیں ہوتی' ہجوم میں دعوت ہوتی ہے۔غرض جب ہم ہر معاملے میں نبی ﷺ کے طریقوں کی طرف دیکھیں گے تو تب ہی ہماری ہر عبادت قبول ہوگی اور اس میں برکتیں بھی ہوں گی چاہے وہ نماز، روزہ ، حج اور قربانی کا معاملہ ہو یا سیاست اور جہاد کا معاملہ ہو۔ اگر جہاد بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام اورطریقوں کے مطابق نہیں ہوگا تو وہ بھی اللہ کے ہاں مردود ہوگا۔

تلوار کے ذریعے اسلام پھیلنے کا مطلب:

یہاں پر برسبیل تذکرہ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگر مسلمان ہجومی اور اقدامی جہاد کریں، کافروں کو دعوت دے کر پہلے اتمام حجت کرلیں، پھر کافروں کے ساتھ جہاد کریں اور کافر مغلوب ہو جائیں، مسلمان زبردست طاقت میں آجائیں تب بھی اس کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ اب کافروں کی گردن پر بندوق رکھ کر انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمان ہوجائیں۔ اب بھی انہیں دعوت دے کر دلیل کے ذریعے مسلمان

ہونے پر آمادہ کیا جائے گا۔کسی کافر کو ہم بندوق یا تلوار کے زور پر مسلمان بننے اور کلمہ پڑھنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اور نہ کبھی اسلام تلوار کے زور پر اس طرح پھیلا ہے۔ ہم جب کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا تو اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں کیا گیا۔ مسلمان جب جہاد کے ذریعے غالب آئے اور کافر مسلمان نہ بھی ہونا چاہتے تو انہیں اس کی مکمل آزادی دی جاتی البتہ انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اسلامی ریاست کے تحت رہ کر جزیہ ضرور دینا پڑتا۔ جہاد کا مقصد کافروں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ کافروں کا وہ نظام، وہ قوت اور وہ ادارے اور وسائل جن کے ذریعے سے دنیا میں کفر قائم ہوتا ہے، ان سب کو جہاد کے ذریعے توڑ کر اللہ کے حکم کے آگے پست اور مجبور کر دیا جائے۔ لوگ جن کافر قوتوں اور اداروں کے ڈر سے یا کسی خوف اور طمع یا مجبوری کی وجہ سے کفر کو نہیں چھوڑتے یا کسی اور رکاوٹ کی وجہ سے اسلام کی دعوت کو آزادانہ سمجھ اور اپنا نہیں سکتے تو ایسی تمام رکاوٹوں کو ہی جہاد کے ذریعے ختم کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جب یہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی تو پھر کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ اس طرح بنایا گیا ہے بلکہ دنیا نے دیکھا کہ جب جہاد کے ذریعے یہ رکاوٹیں ختم ہو جاتی تھیں تو لوگ خود بخود اسلام کی طرف امڈ امڈ کر اور لپک لپک کر آتے تھے کیونکہ اسلام دین فطرت ہے اور کسی بھی عقل سلیم رکھنے والے انسان کو اسلام کی دعوت کو آزادانہ سمجھنے کا موقع ملے تو وہ اسے اپنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلام کے غلبے کی صورت میں اگر کافر پھر بھی اپنے کفر پر قائم رہنا چاہیں تو انہیں اسلام اس کی آزادی دیتا ہے اور صرف ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور اس حد تک جہاد کرنا مسلمانوں کے لئے لازمی بھی ہوتا ہے کہ جس کے نتیجے میں کافر کم از کم جزیہ دینے پر تیار ہو جائیں۔

سورۂ توبہ میں اللہ نے فرمایا:

﴿ قَاتِلُوْا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوْا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ○﴾ [التوبة :۲۹/۹]

''(مسلمانو!) ان لوگوں کے خلاف قتال کرو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں جانتے نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے۔ یہاں تک قتال کرو کہ وہ اپنے ہاتھ سے تمہیں جزیہ ادا کریں۔ اور وہ تمہارے سامنے چھوٹے (ذلیل اور پست) ہوجائیں۔

''دین میں جبر نہیں'' کا مطلب:

مذکورہ بالا آیت سے واضح ہو گیا کہ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے باغی کافر مسلمانوں کے مقابلے میں چھوٹے' پست اور ذلیل ہوجائیں۔ مسلمان کافروں کے مقابلے میں معزز اور حاوی ہوجائیں۔ کافر مسلمانوں کو جزیہ دینے پر مجبور ہوجائیں لیکن یہ مقصد نہیں کہ کافروں کو زبردستی مسلمان بنانا ہے بلکہ کفر کو توڑنا اصل مقصد ہے۔

﴿ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾

''ان سے قتال کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ (کفر وشرک) باقی نہ رہے۔''

قتال کا مقصد فتنے کا خاتمہ ہے۔ کفر وشرک کی قوت، جس کی وجہ سے فتنے پھیلتے ہیں اور کفر کے ادارے اور نظام مضبوط ہوتے ہیں، اس قوت کو ختم کرنا جہاد کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اس قوت کے خاتمے سے ہی لوگوں کے لئے دعوت کے دروازے کھل

جاتے ہیں اور لوگ خود بخود مسلمان ہوجاتے ہیں۔ قرآن نے قتال فی سبیل اللہ کے یہی مقاصد بتائے ہیں کہ

۱۔ فتنے کا خاتمہ ہو

۲۔ کافروں سے جزیہ لیا جائے

۳۔ اور کافروں کو ذلیل کرکے ان کی قوت چھین کر حکومت اپنے ہاتھ میں لی جائے

جہاد و قتال کے ان مقاصد میں کافروں کو زبردستی مسلمان کرنا کہیں بھی نہیں اور نہ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" دین میں جبر نہیں' تو اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ کافروں پر جہاد کے ذریعے سیاسی غلبہ تو حاصل کیا جائے گا' اسلام کی دعوت کی راہ میں رکاوٹیں تو ختم کی جائیں گی لیکن کسی کو تلوار کے زور پر مسلمان نہیں کیا جائے گا۔ جب جہاد کے ذریعے دعوت کے دروازے کھلتے ہیں تو لوگ الحمد للہ خود ہی اس دین فطرت کو قبول کر لیتے ہیں۔

کیا اللہ کی عبادت خوف اور طمع (جہنم کے ڈر اور جنت کے لالچ وغیرہ) کے ساتھ نہ کی جائے؟

عام لوگوں کے ہاں بہت بڑا غلط اور گمراہ کن عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اللہ کی عبادت جہنم کے ڈر یا جنت کے لالچ وغیرہ کے ساتھ نہیں کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں بعض بڑے بڑے صوفی شاعروں نے اس گمراہ کن عقیدے کے حق میں بہت سے شعر بھی بنائے ہوئے ہیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جنت کے لالچ یا جہنم کے ڈر سے اللہ کی عبادت کرنا یا کوئی نیک عمل کرنا شرک ہے۔ حالانکہ اس بے بنیاد عقیدے کی آڑ میں خود ان صوفیاء نے شرک کے بڑے بڑے دروازے کھول رکھے ہیں۔ اللہ نے قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ﴾ [السجدہ : ۱۶/۳۲]

''وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔''

یعنی مومنین اپنے رب کی عبادت خوف اور لالچ کے ساتھ کرتے ہیں۔

خود نبی ﷺ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

« اَسْأَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِهِ مِنَ النَّارِ » (ابو داؤد)

''میں اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور دوزخ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔''

مذکورہ حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جنت کے حصول کی تمنا کرنا اور دوزخ سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگنا خود نبی ﷺ سے ثابت ہے لیکن بعض صوفیاء اس کا انکار کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی رضا کے حصول کیلئے عبادت کرنی چاہئے۔ جنت و دوزخ کو ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس میں خودغرضی آجاتی ہے۔ حالانکہ حدیث رسول ﷺ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ خود نبی ﷺ جنت کا سوال اور جنت کی خواہش وتمنا کرتے تھے۔ اسی طرح جہنم سے پناہ مانگتے۔ جب یہ بات نبی ﷺ سے ثابت ہے تو پھر ہم اس مسئلے میں اپنی عقل اور اپنا فلسفہ پیش کرنے کی جرأت کیوں کریں؟ جوشخص یہ کہتا ہے کہ میں جہنم کے عذاب سے ڈر کر اور جنت کے حصول کے لئے اللہ کی عبادت نہیں کر رہا' وہ دراصل ایک گھمنڈ اور تکبر کا شکار ہوتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کر رہا ہوتا ہے کہ مجھے جنت و دوزخ کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں ان چیزوں سے بےغرض ہوں۔ حالانکہ اللہ نے انسان کو اپنا غرض مند اورمحتاج بنایا ہے۔ اللہ کو اپنے آگے سوال کرنے والا غرض مند انسان ہی پسند ہے۔ بے نیازی انسان کی نہیں' صرف اللہ کی شان ہے۔ شیطان نے انسان کے اندر وسوسہ ڈالا کہ جنت کے حصول اور جہنم سے بچنے کے لئے اللہ کی عبادت کرنا خودغرضی ہے لیکن دراصل اس وسوسہ کی آڑ میں اسے متکبر بنادیا۔ اور اسے عملاً اس گمراہ کن فلسفے میں ڈال دیا کہ تو جنت کا محتاج نہیں اور نہ تو اللہ کے عذاب اور جہنم سے ڈرتا ہے۔ تکبر ابلیس کی گمراہی کی سب سے بڑی وجہ تھی اور انسانوں کو بھی وہ زیادہ سے زیادہ اسی گمراہی کے زیر دام لانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ صوفیاء اس فلسفے کے سب سے زیادہ اسیر ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے حالات میں دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ تکبر انہی میں پایا جاتا ہے۔ باقی انسان اگر اللہ کی عبادت زیادہ نہیں کرتے، اللہ کے حقوق کی کما حقہ

ادائیگی نہیں کرتے تو اسے وہ اپنی کمی، کمزوری یا کوتاہی وغیرہ قرار دیتے ہیں لیکن صوفیاء کے ہاں حال یہ ہے کہ وہ جوں جوں تصوف کی منزلیں اور مدارج طے کرتے جاتے ہیں، نماز روزہ وغیرہ کی عبادت کو وہ اپنے لئے غیر ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں وہ ظاہری عبادات کا نام دے دیتے ہیں۔ اور جو مخصوص قسم کے وظائف اور طریقے عبادت کے لئے خود انہوں نے آپ گھڑے ہوتے ہیں، انہیں وہ اصل اور باطنی عبادت کہتے ہیں۔ دراصل یہ شیطان کا ڈالا ہوا ایسا وسوسہ ہے کہ پہلے تو انہیں جنت و دوزخ کی فکر سے آزاد کیا۔ انہیں بے نیاز اور متکبر کیا۔ پھر نماز، روزہ وغیرہ کو ظاہری عبادت کا نام دلا کر ان سے انہیں پرے کیا یعنی اللہ کی عبادت سے دور کردیا اور پھر ان سے خود ساختہ عبادت کے طریقے ایجاد کرائے اور انہیں اصل اور باطنی عبادت کا نام دے کر انہیں اپنی اطاعت کے لئے پورا پورا اسیر کرلیا۔ یہ ہے تکبر کا انجام جبکہ اللہ کی عبادت کی بنیاد ہی عاجزی اور انکساری ہے اور تکبر عبادت کے بالکل الٹ اور منافی ہے۔

جب انسان اللہ سے محتاج ہوکر مانگتا ہے کہ اللہ مجھے فلاں چیز دے۔ مجھے فلاں نعمت دے۔ جنت دے تو اللہ سے یہ لالچ رکھنا، اللہ سے مانگنا اور اللہ کے آگے خود کو محتاج اور سوالی بنا کر پیش کرنا یہ بندے کے لائق ہے۔ اور اسی سے اللہ خوش ہوتا ہے کہ بندے اس سے مانگیں اور وہ ان کے سوال پورے کرے۔ اس سے خالق کی قوت وقدرت اور مخلوق کی محتاجی و بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی سے خالق اور مخلوق میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ایک بیٹا ہے جو باپ سے مانگتا ہے۔ عموماً والدین کو اپنے بچے کی ضرورت اور خواہش کا علم ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے بچے کی زبان سے اس کی خواہش سن کر زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اس کی جائز خواہش کو جلد پورا کرنے کی بھرپور

کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایک بیٹا اپنے باپ سے مانگنا پسند نہیں کرتا۔ وہ بڑی بے پروائی اور بے نیازی سے کہتا ہے کہ میں کیوں باپ سے مانگوں؟ مجھے اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب بتائیے یہ بیٹا باپ کو اچھا لگے گا یا وہ جو بڑے لاڈ پیار اور انکساری کے ملے جلے جذبات کے ساتھ باپ سے مانگتا ہے؟

اللہ سے کچھ نہ مانگنا اور دعا نہ کرنا تکبر ہے:

بہت سے لوگ کہتے ہیں، ہمیں اللہ سے کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔ کیا اللہ کو نہیں پتہ کہ ہماری کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ اللہ سے دعا ہی نہیں مانگتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴾ [المؤمن: ٤٠/٦٠]

''لوگو! مجھ سے دعائیں کیا کرو۔ میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ جو لوگ مجھ سے مانگنے سے تکبر کرتے ہیں، یقین مانو، وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔''

اس آیت سے واضح ہوگیا کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا، وہ متکبر ہے۔

اگر جنت کا لالچ رکھنا اور جہنم سے پناہ مانگنا جائز نہ ہوتا تو پھر اللہ کے قرآن میں جہاں کہیں جنت کا ذکر آتا ہے تو اسے بڑی خوبصورتی سے بیان نہ کیا جاتا۔ قرآن میں جنت کے مناظر، اس کے رنگا رنگ پھل، میووں، دودھ اور شراب سے لبالب نہروں، چھپے ہوئے موتیوں جیسی حوروں اور تاحد نظر عالیشان محلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ کیلئے رنج وغم اور پریشانیوں کے خاتمے کی بات کی جاتی ہے۔ اس طرح

جب جہنم کا ذکر آتا ہے تو اس کی زبردست ہولنا کی اور شدت کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی پھنکاریں مارتی ہوئی آگ، اس کی خوفناک گہرائی، لہو، پیپ اور تھور وزقوم کے درختوں کی صورت میں وہاں کے کھانے اور پینے کے لئے کھولتے ہوئے پانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انسانوں کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لئے لالچ، ڈر اور ترغیب وترھیب کا یہ انداز خود اللہ نے قرآن کریم میں اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کا یہ ڈر اور جنت کی طمع انسان میں نہ رہے، یہ عقیدہ، سوچ اور فکر انسان کے ذہن سے نکال دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے جزا سزا کا کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ پھر اس کے لئے گناہ ثواب کے سب کام برابر کی حیثیت اختیار کر جائیں گے۔ نیکی بدی میں کوئی تمیز نہ رہے گی۔ انسانی معاشرے کو اللہ نے اسی سزا وجزا کے عقیدے کی بنیاد پر ایک پابند معاشرہ بنایا ہے اور اگر یہ عقیدہ اٹھ جائے تو پھر معاشرہ تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوکر جانوروں کے معاشرے کا منظر پیش کرنے لگے گا۔

جو لوگ دنیا کے لالچ میں آکر آخرت کے لالچ سے بے پرواہ ہوجاتے ہیں، اللہ کو پکارنا اور اس سے پناہ مانگنا چھوڑ دیتے ہیں، قیامت کے دن ان کے حال کا دردناک نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے۔ وہ جہنم میں اللہ کو پکاریں گے۔ وہاں کی ہولناک آگ سے نجات مانگیں گے۔ دنیا میں تو اللہ کو پکارنا اور اللہ سے مانگنا عار سمجھتے تھے۔ سزا وجزا کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ برا بھلا جیسا عمل چاہا کر لیتے تھے لیکن جہنم کا مزہ چکھتے ہی پکار اٹھیں گے کہ اے اللہ ہمیں ایک بار دنیا میں پھر بھیج دے۔ اب ہم تجھے ہی پکاریں گے۔ تجھ سے ہی مانگیں گے۔ تیری ہی عبادت کریں گے۔ تمام برے کام اور اپنی بنائی ہوئی عبادتیں، طریقے اور فلسفے چھوڑ دیں گے۔

﴿ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

[الانعام : ٢٧/٦]

''پس کہیں گے ، ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہوجائیں۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کی حقیقت کھولتے ہوئے بیان فرمایا:

﴿ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَ لَوْرُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ ﴾ [الانعام: ٢٨/٦]

''بلکہ (یہ سب باتیں اب وہ اس لئے کرنے لگے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے دبایا کرتے تھے (جہنم سے بے پرواہ تھے) وہ (اب) ان کے سامنے آ گئی ہے، اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے جائیں، تب بھی یہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

چنانچہ یہ جہنم میں اللہ کو پکار پکار کر تھک جائیں گے لیکن اللہ ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرے گا بلکہ کہا جائے گا۔

﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ ''آج ہم نے تمہیں بھلا دیا۔'' [السجدة : ١٤/٣٢]

جس طرح دنیا میں تم ہمیں پکارنا فراموش کئے ہوئے تھے، ہم بھی آج تمہاری کوئی پکار نہیں سنیں گے۔ جب دوزخی سمجھ لیں گے کہ آج بار بار مانگنے کے باوجود اللہ ان کی دعا قبول نہیں فرماتا بلکہ کان بھی نہیں لگاتا تو بالآخر جہنم کے داروغوں کو پکاریں گے۔ انہیں کہیں گے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ ﴾ [المومن : ۴۰/۴۹]
''تم ہی اپنے پروردگار سے دعا مانگو کہ وہ کسی دن تو ہمارے عذاب میں کمی کردے۔''

﴿ وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ﴾ [الزخرف :۴۳/۷۷]
''اور پکار پکار کر کہیں گے، اے مالک! (جہنم کے داروغے) تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے۔''

﴿ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ [الزخرف : ۴۳/۷۷]
''وہ (جہنم کا داروغہ) کہے گا کہ (ظالمو!) تمہیں تو (اب یہیں) رہنا ہے۔''

مذکورہ بالا ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہوا کہ ایک مومن اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ اس کے دل میں آخرت اور جہنم کے عذاب کا ڈر ہو اور اللہ سے جنت کے حصول کی شدید تمنا ہو، تب اس کی عبادت صحیح ہوگی۔ اور جو جہنم سے بچنے اور جنت کو مانگنے کی تمنا دل میں رکھنے اور اللہ سے مانگنے اور دعا کرنے کو عار سمجھتے ہیں، وہ تکبر کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی عبادت کسی طور درست نہیں ہوتی۔

بعض شبہات کا ازالہ:

شبہ:۔ حدیث میں آتا ہے کہ
« مَنْ قَالَ لَا اِلٰه اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ » (ابن حبان)
''جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا، وہ جنت میں داخل ہوگیا۔''

اس حدیث کی رو سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر کلمہ گو چاہے وہ کتنا ہی بے عمل ہو یا اس کی عبادت کا طریقہ کچھ بھی ہو اور وہ جنت دوزخ کی فکر رکھے یا نہ رکھے، جنت بہر حال اسے ملے گی؟

ازالہ:۔ اس کی تشریح دیگر احادیث میں موجود ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

« وَ عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ اَحَدٍ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّا مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَادِقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَی النَّارِ » (متفق علیه)

''جس کسی نے لا الہ الا محمد رسول اللہ کی شہادت سچے دل سے دی اسے اللہ آگ ہر حرام کردے گا۔''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

« مَنْ لَقِیَكَ مِن وَّرَآءِ هٰذَا الْحَائِطِ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَیْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ » (رواہ مسلم)

''جو شخص ''لا الہ الا اللہ'' کی شہادت دے اس حال میں کہ اس کا دل اس یقین رکھنے والا ہو اسے جنت کی بشارت دو۔''

اس حدیث کے مفہوم میں سلف کے ہاں بہت بحث کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر سب نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جتنی بھی شریعت ہے، سب لا الہ الا اللہ کا حصہ ہے۔ صحابہ کرام نے اس کی عملی تفسیر پیش کی۔ آپ دیکھ لیں کہ جو صحابی بھی لا الہ الا اللہ کہتا تھا، وہ نماز پڑھتا تھا۔ ایک بھی صحابی نماز کا تارک نہ تھا۔ کسی بھی صحابی نے اس حدیث کی تفسیر یہ نہیں سمجھی کہ جس نے لا الہ الا اللہ پڑھ لیا، وہ جنت میں داخل ہوگیا لہٰذا اب اسے نماز اور دیگر عبادات کی ضرورت نہیں یا کوئی یہ سمجھا ہو کہ وہ اب لا الہ الا اللہ صدق دل سے پڑھ کر ایمان کے ایسے درجے پر پہنچ گیا ہے کہ اب اسے ظاہری عبادات کی حاجت نہیں۔ ایسی خود ساختہ تشریحات اور تاویلات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین میں سے کسی نے بھی اختیار نہیں کیں۔ بلکہ نماز تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں

مسلمان اور کافر کے درمیان فرق قائم کرنے کا معیار تھا۔ اسی طرح وہ روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد جیسے فرائض اور عبادات کی ادائیگی بھی برابر کرتے تھے۔ وہ ان تمام عبادات اور پوری شریعت کو لا الہ الا اللہ کے اندر داخل سمجھتے تھے۔

اس حدیث کا ایک دوسرا مفہوم جو سلف کے ہاں لیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس نے بھی لا الہ الا اللہ کہہ دیا، اس میں گو بہت سی کوتاہیاں ہوں، بہت سے گناہ کئے ہوں، وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے نہیں جائے گا بلکہ اپنے گناہوں کے مطابق دوزخ میں سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں ضرور جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ

«یُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ فِی قَلْبِهٖ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَیْرٍ»

''جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر (ایمان) موجود ہوگا تو اسے جہنم سے نکال دیا جائے گا۔'' (بخاری)

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ لا الہ الا اللہ کہنے والے بھی کئی لوگ جہنم میں جائیں گے تب ہی انہیں جہنم سے نکالنے کی بات کی گئی ہے۔ سلف میں سے بھی یہ مطلب کسی نے نہیں لیا کہ لا الہ الا اللہ کہنے والا جو چاہے عمل کرتا رہے، اسے اپنے اعمال کے بقدر دوزخ میں کسی صورت سزا نہیں ملے گی اور وہ دوزخ میں جائے بغیر سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ یہ مفہوم سلف نے کہیں بھی اختیار نہیں کیا۔

شبہ:۔ بعض لوگ کہتے ہیں، حقوق اللہ تو معاف ہوجائیں گے لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ یعنی نماز، روزہ وغیرہ کا کوئی اہتمام نہ بھی کرے لیکن اگر اس نے صرف حقوق العباد پورے کئے ہوں تو اللہ اسے جنت میں لے جائے گا۔

ازالہ:۔ حقوق العباد کی ادائیگی مسلمان بھی کرتے ہیں اور غیر مسلم بھی کرتے ہیں لیکن ہماری اور ان کی ادائیگی میں ایک جوہری اور بنیادی فرق ہے۔ ہم اگر حقوق

العباد کی ادائیگی کرتے ہیں، ماں باپ کا احترام کرتے ہیں، اپنے ہمسائیوں ، دوستوں، رشتہ داروں، تعلق داروں اور دیگر انسانوں کے حقوق پورے کرتے ہیں تو اس لئے کہ ہمیں یہ اللہ کا حکم ہے۔ اگر کوئی لوگوں کی دیکھا دیکھی اور معاشرے کی روایات کی وجہ سے یہ حقوق پورے کرتا ہے، اللہ کا حکم سمجھ کر یہ حقوق پورے نہیں کرتا تو اللہ کے ہاں اسے ان حقوق کی ادائیگی کا آخرت میں کوئی اجر نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس نے ایسا معاشرے کی روایات کی وجہ سے کیا ہے۔ اگر یہ روایات بدل جائیں تو یہ بھی ماں باپ کے احترام وغیرہ کی روایات بدل لے یا یہ روایات نہ ہوتیں تو یہ بھی سرے سے ان کا کوئی احترام نہ کرتا۔ مسلمان اور کافر میں فرق ہی یہی ہے کہ مسلمان حقوق العباد کی ادائیگی بھی اللہ کا حکم سمجھ کر کرتا ہے۔ اب معاشرے کی روایات، قوانین اور رسوم ورواج چاہے جس قدر بھی بدل جائیں ، مسلمان ہر حالت میں ماں باپ کا احترام اور دیگر انسانوں کے حقوق بدستور پورا کرنے کا پابند ہوگا۔ حالات کی تبدیلی اسے ان حقوق کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔

جب حقوق العباد کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم انہیں اللہ کا حکم سمجھ کر ہر حالت میں ا دا کرتے ہیں تو پھر جس اللہ نے یہ حکم دیا ہے، اس کا حق سب سے پہلے ہے۔ باقی سب کے حقوق اس کے بعد ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَالَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾
[لقمان : ۱۵/۳۱]

''اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر زور دیں کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک

ٹھہرا جن کا تجھ کو علم نہیں تو (اس کام میں) ان کا کہنا نہ مانو۔''

اسی طرح نبی ﷺ نے فرمایا:

« لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ » (مسلم)

''جہاں خالق کی نافرمانی کرنی پڑے، وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔''

یعنی ماں باپ کے ساتھ اگر ہم حسن سلوک کرتے ہیں تو اس لئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے لیکن اگر یہ ماں باپ شرک وکفر پر مجبور کردیں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم ہے اسی طرح دیگر مخلوق یعنی استاد، حاکم، امام، مولوی وغیرہ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے کہ ان کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ گویا حقوق العباد کی ادائیگی بھی اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کا حق زیادہ ہے۔ اگر کوئی حقوق العباد پورے کرتا ہے، بندوں کو ان کے حقوق کے معاملے میں راضی کرتا ہے تو اس لئے کہ یہ بھی اللہ کا حکم ہے۔ اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو بندوں کے حقوق پورے کرنے اور انہیں راضی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اصل اہمیت تب بھی اللہ کے حکم کو ہی حاصل ہے۔ حقوق العباد کو اللہ کے حکم اور اللہ کے حقوق پر پھر بھی کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ جب حقوق العباد کو حقوق اللہ پر کوئی ترجیح نہیں تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس نے حقوق العباد میں کوئی کمی کی اسے تو معاف نہ کیا جائے لیکن اللہ کا حق جس نے کوئی بھی پورا نہ کیا ہو، اسے معاف کردیا جائے۔

یہ مسئلہ ہم ایک اور اہم دلیل سے واضح کرتے ہیں۔ اللہ کا سب سے بڑا حق اس کی توحید کا اقرار کرنا ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (النساء:.....)

''اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشے گا۔ اس کے سوا جو چاہے گا، گناہ بخش دے گا۔''

اب اللہ تعالیٰ نے اپنے حق یعنی توحید کو نہ ماننے والے کو تو ناقابل بخشش قرار دیا ہے لیکن اس کے سوا جو چاہے گناہ بخشنے کا اعلان کیا ہے۔ حقوق العباد کے متعلق ایسا اعلان کہیں بھی نہیں ملتا کہ جس نے بندوں کا فلاں فلاں حق ادا نہ کیا تو اسے نہیں بخشا جائے گا۔ اس لئے ہمیں یادرکھنا چاہئے کہ حقوق اللہ کی اہمیت حقوق العباد سے زیادہ ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ ادا کرنا کسی صورت معاف نہیں۔ اور نہ کوئی مسلمان یہ انداز اختیار کرے کہ میں چونکہ حقوق العباد پورے کرتا ہوں، صدقہ و خیرات اور رفاہ عامہ کے بہت کام کرتا ہوں، اس لئے اب مجھے نماز، روزہ، جہاد وغیرہ کی ادائیگی کی ضرورت نہیں۔ میں حقوق اللہ ادا کئے بغیر ہی بخشا جاؤں گا۔ یہ سراسر گمراہی، عقیدے کی خرابی اور شیطان کے وسوسے ہیں۔

عبادت میں احسان

''مَا هُوَ الْاِحْسَانُ فِی الْعِبَادَةِ'' ''عبادت میں احسان کیا ہے؟''

﴿ اَلْاِحْسَانُ هُوَ مُرَاقَبَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی فِی الْعِبَادَةِ ﴾

عبادت میں اللہ کی مراقبت احسان ہے۔ گویا کہ انسان اللہ کی عبادت اس احساس کے ساتھ کرے کہ وہ اللہ کی نگرانی میں ہے۔ اس سے عبادت میں انہماک اور خشوع پیدا ہوتا ہے۔ یہی عبادت میں احسان ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ○ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ○﴾

[الشعرآء: ۲۶/۲۱۸،۲۱۹]

'' اللہ تجھے دیکھتا ہے جب تو اکیلا قیام کی حالت میں ہوتا ہے اور جب تو جماعت میں لوگوں کے ساتھ ساتھ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔''

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

« اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ یَرَاكَ »

'' احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو کہ تم اسے دیکھتے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھتا ہے۔'' (مسلم)

لغوی طور پر احسان حسن سے ہے۔ حسن کا معنی اچھائی اور خوبصورتی ہے۔ گویا احسان کا معنی کسی چیز کو خوبصورت اور اچھا بنانا ہے۔ مذکورہ آیت اور حدیث میں احسان کا مقصود یہی بتانا ہے کہ ہم اپنی عبادت کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت ، دلآویز

اور بہتر کیسے بنا سکتے ہیں کیونکہ جب ہم اللہ کی عبادت کر رہے ہیں تو یہ عبادت بہت اچھی ہونی چاہئے ۔نماز، روزہ ہو ،دعا اور ذکر ہو یا دعوت وجہاد ،عبادت کی ہر قسم میں بہت زیادہ انہماک اور توجہ ہونی چاہئے۔ توجہ کیلئے یہ احساس دلایا گیا ہے کہ عبادت کرنے والا اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پائے۔ جب وہ محسوس کرے گا کہ اللہ میرے سامنے ہے یا میں اللہ کے سامنے ہوں، اللہ میرے ظاہر اور باطن کو دیکھ رہا ہے، وہ میری نیت کو جانتا ہے تو مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔ اس سے عبادت میں خشوع پیدا ہوگا۔ اور انسان لذت محسوس کرے گا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ عبادت میں خشوع اور انہماک عبادت کا رکن ہے۔ اور عبادت میں اپنے آپ کو اللہ کی طرف کامل متوجہ کرلینا اور ہر نقص دور کرکے عبادت کو بہترین بنانا احسان ہے۔

احسان کے متعلق حدیث جبریلؑ بہت مشہور ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے۔ اچانک ایک آدمی آیا جس کے کپڑے بہت سفید تھے اور بال بہت سیاہ تھے۔ اس پر سفر کا کوئی اثر نہ تھا نہ ہی ہم اسے پہچانتے تھے۔ (یعنی اگر دور سے آیا ہوتا تو اس پر سفر کے آثار ہوتے، اگر قریب سے آیا ہوتا تو ہم میں سے کوئی اسے جانتا ہوتا) وہ نبی ﷺ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر رکھ لئے (بہت مؤدب ہوکر بیٹھا) اور کہا، اے محمد ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق بتائیے (اسلام کیا ہے؟) نبی ﷺ نے فرمایا.....تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں اور محمد ﷺ یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اور نماز کو صحیح طور پر ادا کرو اور اپنے مال کی زکوۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور بشرط توفیق بیت اللہ کا حج ادا کرو۔ اس نے کہا۔ صَدَقْتَ آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ ہمیں تعجب ہوا کہ پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ (یعنی اسے

معلوم ہے تو پوچھتا ہی کیوں ہے اور اگر معلوم نہیں تو تصدیق کیسے کرتا ہے) پھر کہا، آپ ﷺ مجھے ایمان کی بابت بتائیے تو آپ ﷺ نے فرمایا.....تم اللہ کے وجود پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، تقدیر کی اچھائی اور برائی پر ایمان لاؤ۔ اس نے کہا، آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ پھر کہا، آپ ﷺ بتائیں، احسان کیا ہے، فرمایا، تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو یوں سمجھو کہ وہ تمہیں یقیناً دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا، آپ (ﷺ) مجھے قیامت کے متعلق بتائیں۔ (یعنی قیامت کب ہوگی) فرمایا، جس سے سوال کیا جا رہا ہے، وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے کہا، اس کی نشانیاں بیان فرمائیں۔ فرمایا۔ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی (یعنی اولاد ماں پر حکومت کرے گی اور والدین کی نافرمان ہوگی یا مالک اپنی نوکرانیوں کے ساتھ زنا کریں گے اور ان سے اولاد ہوگی) اور تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں والے، ننگے بدن والے، تنگدست، بکریاں چرانے والے، عظیم الشان عمارتیں بنائیں گے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر وہیں ٹھہرا رہا۔ نبی ﷺ نے فرمایا۔ عمر رضی اللہ عنہ جانتے ہو، یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا۔ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: یہ جبرائیل تھے۔ تمہیں دین سکھانے کیلئے تشریف لائے تھے۔ (مسلم)

ایک مسلمان کے لئے دین کا کم ازکم اتنا علم اور عمل ضروری ہے:

مذکورہ حدیث میں اسلام کے پانچ ارکان کا بیان ہوا ہے، جن پر عمل کرنا ضروری ہے اور ایمانیات سے متعلق چھ چیزیں بیان کی گئی ہیں، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ عقیدہ اور عمل سے متعلق کل گیارہ چیزیں ہیں، محدثین اور شارحین کا اس بات پر

اتفاق ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کرنا اور سیکھنا ضروری ہے۔ اور جو اسلام کی ان گیارہ چیزوں یعنی چھ ایمانیات اور پانچ ارکان کو نہیں مانتا یا کسی ایک کا انکار کرتا ہے، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ کیونکہ عقیدہ وایمان اور عمل سے متعلق یہ چیزیں دین کی بنیاد ہیں اور انہی پر دین کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ نماز کیا ہے؟ اسے کیسے ادا کرنا ہے، روزہ رکھنے کا طریقہ کیا ہے، حج کیسے ادا کیا جائے گا، زکوۃ کا نصاب اور ادائیگی کا طریقہ وغیرہ کیا ہے، تو ان چیزوں کو جانے اور سیکھے اور عمل کئے بغیر کوئی شخص کیسے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ ہمارے ہاں سکول وکالجز وغیرہ میں یہ حدیث تو بڑے اہتمام سے پڑھائی جاتی ہے کہ ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ'' (ابن ماجہ) بلکہ اس کے ساتھ وَمُسْلِمَةٍ کے لفظ کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے حالانکہ ''مُسْلِمَة'' کے الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ ویسے بھی عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ عام طور پر جہاں صرف مذکر مخاطب ہو تو اس میں مؤنث بھی خود بخود شامل ہوتی ہے۔ بہرحال یہ حدیث تو بیان کی جاتی ہے کہ ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے اور یہ علم جو ہر مسلمان پر فرض ہے، وہ یہی دین کا بنیادی علم ہے لیکن عملا ہمارے ان تعلیمی اداروں میں یہ حدیث پڑھائے جانے کے باوجود سارا زور بے دینی سیکھنے، کافروں کے فلسفے، عشقیہ شعر وادب یا محض دنیاوی معلومات وفنون کے حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔

نماز، ورزش اور اٹھک بیٹھک کے لئے نہیں:

عقیدہ وعمل کی ان بنیادی باتوں کے ذکر کے بعد حدیث جبریل علیہ السلام میں تیسری اہم چیز احسان کے متعلق بتایا گیا ہے یعنی اس بات کا ذکر ہے کہ ہماری عبادت میں

خوبی کیسے پیدا ہوگی؟۔ ہم اپنی عبادت میں اتنی خوبصورتی اور حسن کس طرح لائیں کہ اللہ کے ہاں یہ مقبول ہوجائے۔ گویا یہ سمجھا یا جا رہا ہے کہ ہم اپنی نماز کو مجبوری یا ڈیوٹی کے انداز میں رسماً ادا نہ کریں کہ بس تھوڑا سا اٹھیں، بیٹھیں، جھکیں اور سلام کر کے نکل جائیں۔ ہماری عبادت اٹھک بیٹھک کا نام نہیں ہے۔ بعض لوگ اسے ورزش کے طور پر بھی ادا کرتے ہیں۔ نماز سے یقیناً ورزش کا ضمنی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن ہماری عبادت کا اصل مقصد ورزش کرنا نہیں۔ جو اس نیت سے نماز ادا کرتے ہیں، اللہ کے ہاں ان کی ایسی عبادت مقبول نہیں ہوسکتی۔ نماز ہمیں ورزش کے لئے نہیں، اللہ کے حکم کی اطاعت سمجھ کر ادا کرنے کا حکم ہے۔ اور اس کی ادائیگی میں حسن بھی تب ہی پیدا ہو سکتا ہے، جب اسے اللہ کا حکم سمجھ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق ادا کیا جائے۔ ہر عمل کو شریعت کے مطابق اچھے سے اچھے طریقے سے ادا کرنا ہی عبادت کا تقاضا ہے۔

نماز میں خیالات و وساوس کی وجہ:

ہمارے ہاں عام طور پر بہت سے لوگوں میں یہ الجھن پائی جاتی ہے کہ نماز کے دوران انہیں مختلف خیالات بہت آتے ہیں اور ان کی توجہ نماز میں یکسو نہیں ہوتی۔ تو اسی توجہ اور خشوع وخضوع کو پیدا کرنے کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ طریقہ بتایا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جب انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہے ہیں، اس کی نگرانی فرما رہے ہیں، اس کی ایک ایک حرکت حتی کہ قلب وذہن کے خیالات بھی اس کے علم میں ہیں تو انسان کے اندر

خود بخود عبادت میں یکسوئی پیدا ہوجاتی ہے۔ ادھر ادھر کے وساوس چھٹ جاتے ہیں۔ اللہ کی طرف دھیان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس توجہ اورخشوع وخضوع سے پھر اللہ کے ذکر اور اللہ کی عبادت میں لذت بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ انسان نماز کے لئے آئے اور ہاتھ باندھتے ہی ہزارہا قسم کے خیالات میں کھو جائے ۔ اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ امام نے کون سی سورۃ پڑھی ہے، کون سی رکعت چل رہی ہے۔ بس ایسے کھڑا ہو جیسے اسے مجبوراً کسی نے نماز کیلئے باندھ دیا ہو۔ یا مشینی انداز میں اپنی حرکات کرے اور چلا جائے۔ جب اللہ کی نگرانی کا یقین ہو جائے تو پھر انسان کی یہ حالت نہیں رہتی۔ اس کی عبادت رسمی نہیں ہوتی۔ روح سے خالی نہیں ہوتی۔ انسان کا اللہ سے تعلق جس قدر مضبوط ہوگا، اللہ سے محبت جس قدر زیادہ ہوگی، اس کی نگرانی کا یقین جس قدر زیادہ ہوگا، اسی قدر اس کی عبادت میں لذت بڑھتی جائے گی۔

جو لوگ نماز کو محض اٹھک بیٹھک بنا لیتے ہیں اور بڑی تیزی سے رکعتیں پوری کرتے ہی بھاگ اٹھتے ہیں، انہیں یاد رکھ لینا چاہئے کہ ان کی نماز درست نہیں ہوتی۔ بخاری ومسلم میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ایسے ہی نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ تو نماز پڑھ ابھی تو نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ دو بارہ نماز پڑھنے لگ گیا۔ نماز پڑھ کر پھر آپ ﷺ کے پاس آ کر سلام کہا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" نماز پڑھ ابھی تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر ویسے ہی نماز پڑھی ۔ آ کر سلام کہا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" تو اب اس نے کہا اے اللہ کے رسول، مجھے نماز سکھا دیجئے۔ پھر آپ ﷺ نے اسے نماز کے ایک ایک رکن کی ادائیگی کا طریقہ سکھایا کہ ہر رکن کو اس طرح ادا کر کہ جس سے

تجھ میں پوری طرح اطمینان (ٹھہراؤ) پیدا ہوجائے۔ آپ ﷺ کے الفاظ تھے۔ ''حَتّٰی تَطْمَئِنَّ رَاکِعًا..... حَتّٰی تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا'' تو رکوع میں ہو یا سجدے میں، ہر رکن پورے اطمینان سے ادا کر۔ اگر دو سجدے کئے جائیں تو ان کے درمیان بھی آپ ﷺ نے اطمینان سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ بھائی کسی رکن کی اچھے طریقے سے ادائیگی کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ بڑی تیزی سے رکعتیں ادا کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے ہوں تو کئی نمازی امام کے برابر چلتے ہیں اور کئی تو ہر رکن میں امام کو بھی پیچھے چھوڑتے چلے جاتے ہیں، جو کہ جائز نہیں۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ امام سے پہلے وہ نماز سے فارغ تو ہو نہیں سکتے۔ پھر نماز میں اس قدر تیزی کا فائدہ کہ اپنی نماز کا حلیہ بھی بگاڑا، اجر بھی گنوایا اور امام سے پہلے پھر بھی فارغ نہ ہو سکے۔ ''خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ'' حالانکہ نماز میں امام کے ساتھ نہ برابری کرنی چاہئے اور نہ اس سے آگے بڑھنا چاہئے۔ نماز جلدی جلدی ادا کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ حدیث میں واضح طور پر آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے (نماز میں) کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد، مسند احمد) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ چوری کے اعتبار سے سب سے برا چور نماز کا چور ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ وہ کیسے چوری کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جو نہ نماز کا رکوع پورا کرے اور نہ سجدہ۔ (مسند احمد)

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں اپنی عبادتوں میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے، آیئے اسے اختیار کرکے اپنی عبادت کو ضائع ہونے سے بچالیں، وہ طریقہ یہی ہے جیسا کہ حدیث میں وضاحت سے بتایا گیا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا کم از کم یہ یقین پیدا کریں کہ اللہ ہمیں دیکھ

رہا ہے۔ اور ہماری ایک ایک حرکت اس کی نگاہ میں ہے۔ ان شاء اللہ جب یہ یقین پیدا ہوگا اور اللہ کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق عبادت ہوگی تو اس میں خود بخود خشوع وخضوع، توجہ، دھیان اور حسن پیدا ہوگا اور یہی عبادت میں احسان ہے۔

کیا اللہ کو دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے؟

احسان کی آڑ میں بندے کو رب بنانے والے گمراہ کن فلسفوں کا تذکرہ:

احسان کے بارے میں حدیث جبرائیل سے بعض لوگوں نے یہ مراد لی ہے کہ اللہ کو ہم دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ صوفیاء نے تو اپنے مسلک تصوف کی بنیاد ہی احسان پر رکھی ہے۔ وہ اپنے مخصوص اذکار اور عبادت کو اپنے مخصوص انداز میں کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان اللہ کی عبادت کرتا ہوا اللہ کے اتنے قریب ہوجاتا ہے کہ وہ اللہ کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے درمیان تمام فاصلے بھی مٹ جاتے ہیں۔ یہ صوفیا اللہ اور بندے کے درمیان فرق ہی کو مٹا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان عبادت کرتا ہوا اللہ سے اس قدر قریب ہوجاتا ہے، اس کی رضا اور اطاعت میں اس قدر ڈھل جاتا ہے کہ بندے اور رب کے درمیان فرق ختم ہوجاتا ہے۔ بندہ رب بن جاتا ہے اور رب بندہ۔ (معاذ اللہ) صوفیا میں یہ نظریہ وحدت الشھود کے نام سے مشہور ہے۔

اس کیلئے انہوں نے اپنی خانہ ساز تاویلات اور فلسفہ کے علاوہ بعض متشابہ قرآنی آیات واحادیث کا سہارا بھی لیا ہوا ہے۔ اور ان کا مفہوم بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ اسی فلسفے سے انہوں نے حلول کا مشرکانہ عقیدہ نکالا ہے کہ اللہ کی ذات بندے کی ذات میں گم ہوجاتی ہے یا وہ کہتے ہیں کہ روح کا وصال اللہ سے ہوجاتا ہے۔ یعنی بندہ

عبادت میں اس قدر ترقی کرتا ہے کہ اس کی روح اللہ کی روح سے مل جاتی ہے اور دونوں یعنی خالق ومخلوق میں معاذ اللہ فرق مٹ جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ صوفیاء کے ہاں کوئی مر جائے تو وہ یہ کہنے کی بجائے کہ وہ فوت ہوگیا ہے، وہ کہتے ہیں اس کا اللہ سے وصال ہوگیا ہے یا مختصرا کہتے ہیں کہ فلاں بندہ وصال فرما گیا ہے۔ اور اب یہ فقرہ عام بھی استعمال ہوتا ہے جس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح احسان، وصال اور اتحاد کی بہت سی اصلاحات ایجاد کرکے بہت سی گمراہیاں پھیلائی گئی ہیں اوران پر عملدرآمد کیلئے ذکر وفکر کے بہت سے طریقے اختیار کئے ہوئے ہیں۔دل چالو کئے جاتے ہیں اور مراقبہ ہال بنا بنا کر مشقیں کروائی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگوں کو سکون حاصل کرنے کے لئے یہ طریقے بتائے جاتے ہیں۔ ایسے تکلفات نبی ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت نہیں ۔ اور ظلم یہ ہے کہ ہندی اور ایرانی فلسفے اور تصوف کو اسلامائز کرنے کیلئے قرآنی آیات واحادیث اور اولیائے کرام کے اقوال کو تاویلات کے ذریعے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حلول، وحدت الوجود، وحدت الشھود اور وصال اور روح کے اتحاد وغیرہ کی تمام اصلاحات ہندی ویدوں اور ایرانی فلسفے سے آئی ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں ہندو مذہب پھیلا ہوا تھا اور اکثر لوگ ہندوؤں سے ہی مسلمان ہوئے تھے۔علم کی کمی اور عقیدے کی ناپختگی کی وجہ سے اسلامی عقیدہ راسخ نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے ہندوؤانہ سلسلے بہت حد تک ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں جیسے شادی بیاہ اور مرنے جینے کی بہت سی رسموں میں ہندو تہذیب کا رنگ موجود ہے۔ ایسے ہی عقائد میں ہندوؤانہ عقیدے موجود ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں فارسی ادب نے بہت سی گمراہیاں پھیلائی ہیں۔ ایرانی فلسفہ فارسی کتب کے ذریعے ہندوستان میں پہنچا۔ لمبا عرصہ ہندوستان کے حکمران فارسی بولنے والے تھے۔ جہاں سے فارسی

زبان اور فارسی لٹریچر عام ہوا اور ان کے ساتھ فارسی فلسفہ نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ لہٰذا عقیدے کی بہت سی خرابیوں کی بنیاد میں ایرانی فلسفہ بھی شامل ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن وحدیث جو اصل اسلام ہے، کی طرف بہت کم توجہ ہے حتی کہ بہت سے دینی مدارس میں بھی قرآن وحدیث سے زیادہ فلسفہ ومنطق اور معانی وکلام کو اہمیت دی جاتی ہے اوران کو پڑھانے میں ہی زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی طبقے میں بھی قرآن وحدیث پرعمل کرنے کی بجائے تاویلات اور قیاسات پرعمل کیا جاتا ہے۔ اس سے شخصیت پرستی نے جڑ پکڑی ہے اور لوگ فرقہ بندی اور تشدد وتعصب کی راہ پر چلے ہیں اور اسلام کی اصل پر قائم نہیں رہے۔ حقیقت میں یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمارے علاقوں میں قائم نہیں ہو سکا اور لوگ اختلافات کا شکار رہے۔ ہم اگر تاریخ اسلامی کا مطالعہ کریں تو عباسی دور میں ہمیں یہ صورت نظر آتی ہے کہ عام لوگ بدعات کا شکار ہوئے۔ قرآن وحدیث پر تمسک کی بجائے فلسفوں اور تاویلات کا رواج ہوا۔ علماء فلسفوں کے پیچھے چل پڑے اور عقلیات نے اصل دین کی جگہ لے لی اور تصوف عام ہوگیا تو خلافت اسلامیہ بھی قائم نہ رہ سکی۔۔ وہی صورت آج ہم دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر برصغیر میں تاویلات اور فلسفیانہ بدعات کا بڑا زور ہے جس سے اسلام کی شوکت وقوت متاثر ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ عوام الناس کو باطل تاویلات سے ہٹا کر قرآن وحدیث کی طرف لایا جائے۔ اور ٹھوس عقیدے پر بنیاد رکھی جائے۔ یہی ٹھوس بنیاد اسلام کے شجرہ طیبہ کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچائے گی اور زمین کے ہر کونے میں پہنچا کر انسانوں کو سایہ مہیا کرے گی۔ اسی سے دعوت کا منشا پورا ہوگا اور جہاد کی بہار آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مروجہ تبلیغی عمل سے برصغیر میں فرقے تو پھیلے ہیں لیکن اسلام نہیں پھیلا۔ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کے اصل قرآن

وحدیث کی طرف لوٹے اور دعوت وجہاد کے عمل سے آگے بڑھے تا کہ اللہ کا دین غالب ہو اور روئے زمین امن پر قائم ہو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حدیث جبرائیل میں احسان سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ انسان اللہ کو دیکھ سکتا ہے؟

اس سلسلے میں اگر دیگر آیات واحادیث کو سامنے رکھا جائے تو اس عقیدے کی سراسر نفی ہوتی ہے کہ کوئی اپنی آنکھوں سے اللہ کو دنیا میں دیکھ سکتا ہے۔ اصول بھی یہی ہے کہ ایک آیت یا حدیث سے بات واضح نہ ہو تو دیگر آیات واحادیث سے مدد لی جاتی ہے۔ ویسے خود اس حدیث کے الفاظ پر بھی اگر پوری طرح غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے قطعاً یہ نہیں کہا کہ احسان سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ الفاظ آپ دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ »(بخاری)

'' احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔''

یہاں الفاظ ہیں'' گویا تم اسے دیکھ رہے ہو'' یعنی تم اسے دیکھ تو نہیں سکتے لیکن اپنی عبادت میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے لئے اور یہ یقین لانے کیلئے کہ اللہ میری نگرانی کر رہا ہے تو اس مقصد کیلئے کہا گیا کہ تم عبادت ایسے کرو کہ تم یہ سمجھو کہ گویا تم اللہ کو دیکھتے ہو۔ یہ بات ہم ایک مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلا کوئی استاد شاگرد کو یا باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ تم شراب نہ پینا یا فلاں برائی نہ کرنا اور اگر کرو گے تو یوں سمجھ لو کہ جیسے میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ تو یہ تصور کرنے کے بعد کوئی بیٹا ایسی

برائی نہیں کرے گا کیونکہ باپ کے سامنے کوئی بیٹا شراب نہیں پی سکتا لیکن اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ باپ ہر برائی کرتے وقت واقعتاً بیٹے کے سامنے بنفس نفیس موجود ہوگا۔ یہی معاملہ اس حدیث میں ہے کہ اللہ کو اپنے سامنے دیکھنے کا مقصد اس کو اپنا نگران سمجھنے اور عبادت میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے لئے ہے اور اللہ تو ویسے بھی ہر وقت ہر جگہ ہر ایک کی نگرانی کرتا بھی ہے اگرچہ وہ ہر ایک کے سامنے بنفسہ یا بذاتہ موجود نہیں ہوتا کیونکہ اللہ بنفسہ تو عرش پر ہی موجود ہے جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے۔

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ : ٢٠/٥]

''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔''

اسی طرح قرآن میں واضح طور پر اللہ کا یہ اعلان موجود ہے کہ

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ..... ﴾ [الانعام : ٦/١٠٣]

''اس (اللہ) کا کوئی نگاہ احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔''

یعنی اللہ سب کو دیکھتا ہے لیکن اللہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ بخاری ومسلم کی مختلف روایات میں آتا ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسروق رحمہ اللہ نے پوچھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے، اللہ سے ملاقات کی تو کیا انہوں نے اللہ کو دیکھا تھا؟ تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، سبحان اللہ، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے (اس بات کو سننے سے) پھر آپ رضی اللہ عنہا نے مسروق رحمہ اللہ کو قرآن مجید کی اسی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا کہ کیا تو نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ مسلم کی روایت میں ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے

مسروق کو فرمایا، جو کوئی سمجھے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے، اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔

موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے بھی دنیا میں اللہ سے دیدار کی فرمائش کی تھی لیکن اللہ نے ان سے فرمایا: لَنْ تَرَانِی تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ (الاعراف۔۱۴۳) تاہم موسیٰ علیہ السلام اور دنیا کے تمام لوگوں پر یہ بات ثابت کرنے کیلئے کہ دنیا میں اللہ کے دیدار کا کوئی شخص متحمل نہیں ہوسکتا، اللہ نے کوہ طور پر اپنی تھوڑی سی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش کر گر پڑے۔

ایسی اور دیگر مختلف آیات واحادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا میں کوئی آنکھ اللہ کا دیدار نہیں کرسکتی البتہ جنتیوں کو آخرت میں اللہ کا دیدار ضرور ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ جنتی جب جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کہے گا، تم اور کچھ چاہتے ہو؟ تو جنتی کہیں گے کہ اے اللہ! کیا تو نے ہمارے منہ سفید (پرنور) نہیں کئے۔ ہم کو جنت نہیں دی۔ جہنم سے نہیں بچایا۔ (اب ہم اور کیا مانگیں) پھر پردہ اٹھ جائے گا۔ اس وقت جنتیوں کو اپنے رب کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز بھلی معلوم نہ ہوگی۔ (مسلم)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب سوال کیا کہ کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھیں گے تو نبی ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا کہ جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوتی (تم سب بیک وقت دیکھ سکتے ہو) اسی طرح تم (قیامت کے دن) اللہ کا دیدار کروگے اور تمہیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ (بخاری ومسلم)

دنیا میں اللہ کو نہ دیکھ سکنا اور آخرت میں جنتیوں کا اللہ کو دیکھنا، ان دونوں چیزوں پر ہمارا ایمان ہونا چاہئے کیونکہ یہ دونوں عقائد قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ اس

سلسلے میں ہم یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ اگر آخرت میں اللہ کو انسان دیکھ سکتا ہے تو دنیا میں کیوں نہیں دیکھ سکتا کیونکہ عقیدہ میں قیاس نہیں چلتا۔ بلکہ عقیدہ وایمان میں جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جس طریقے سے بیان فرما دیں، ان پر اسی طرح ایمان لانا پڑے گا۔ اس میں ہم اپنی طرف سے کوئی عقلی قیاس، کوئی تبدیلی یا کمی بیشی کے مجاز نہیں۔ اسی طرح ہم حدیث جبرائیل علیہ السلام میں اللہ کو دیکھنے سے مراد بھی یہ نہیں لیں گے کہ ہم اپنی آنکھوں سے دنیا میں واقعی اللہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس بات کی دیگر آیات واحادیث سے صراحت کے ساتھ نفی ہوتی ہے اور خود اس حدیث کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ صرف ایسا سمجھنے کی حد تک ہے تاکہ عبادت میں یہ یقین بڑھ جائے کہ ہم اللہ کی نگرانی میں ہیں۔ اس سے نماز اور دیگر عبادات میں ہمارا خشوع وخضوع بڑھانا مقصود ہے۔ اس کے علاوہ ان الفاظ سے دیگر مطالب اور فلسفے نکالنا سراسر گمراہی میں پڑنا ہے اور یہ سلف صالحین کی مجموعی روش کے بھی خلاف ہے۔

توحید کی اقسام اور اس کے فوائد

گزشتہ مضامین میں ہم نے یہ آگاہی حاصل کی کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں؟ عبادت کسے کہتے ہیں؟ اور اس ضمن میں عبادت میں داخل شرعی اور غیر شرعی طریقوں پر ایک تفصیلی بحث آپ نے ملاحظہ کی۔ اب ہمارا اگلا موضوع توحید کی اقسام اور اس کے فوائد سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں چند اہم سوالوں کے جواب پیش خدمت ہیں۔

رسولوں کی بعثت کا مقصد:

پہلا اہم سوال یہ ہے کہ

﴿ لِمَاذَا اَرْسَلَ اللّٰهُ الرُّسُلَ ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو کیوں مبعوث کیا؟''

اس کا جواب ہے:

﴿ اَرْسَلَهُمْ لِلدَّعْوَةِ اِلَى عِبَادَتِهِ وَ نَفْيِ الشِّرْكِ عَنْهُ ﴾

'' اللہ نے رسولوں کو اس لئے بھیجا کہ وہ اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور شرک سے لوگوں کو باز رکھیں۔''

اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ ﴾

[النحل : ٣٦/١٦]

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور

طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔''

اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث مبارک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْاَنْبِیَآءُ اِخْوَۃٌ ..... وَ دِیْنُھُمْ وَاحِدٌ » [متفق علیه]

''تمام انبیاء آپس میں بھائی ہیں اور ان کا ایک ہی دین ہے۔''

قرآن مجید کی مذکورہ آیت اور حدیث رسول ﷺ سے یہ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء اور رسل علیہم السلام کی بعثت اور آمد کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو صرف ایک اللہ کی عبادت پر جمع کریں۔ انہیں توحید کی طرف لائیں۔ شرک سے روکیں کیونکہ لوگ شرک کی طرف بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں۔ شیطان کی کوشش یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور توحید سے ہٹا کر انہیں شرک کی طرف لے جائے جبکہ اس کے مقابلے میں انبیاء کا کام لوگوں کو توحید اور اللہ کی عبادت کی طرف لانا ہے۔ شیطان کو جب جنت سے نکالا گیا تو اس نے اللہ سے اجازت لی کہ وہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اللہ نے اسے اجازت دی کہ وہ جو کر سکتا ہے کر لے لیکن ساتھ ہی اللہ نے یہ بھی بتادیا کہ وہ یاد رکھ لے کہ میرے مخلص بندے تیرے پیچھے نہیں چلیں گے ۔ اب شیطان کی کوشش ہے کہ چونکہ انسان کی وجہ سے وہ جنت سے نکلنے پر مجبور ہوا، اس لئے وہ بھی انسانوں کو جنت میں داخل نہ ہونے دے گا بلکہ وہ سب کو ساتھ لے کر جہنم میں جائے گا۔ جہنم میں لے جانے کا سب سے بڑا اور یقینی راستہ شرک کا راستہ ہوتا ہے۔ اس لئے شیطان کی سب سے بڑی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ لوگوں کو شرک کی طرف کھینچے کیونکہ شرک ایک ایسی چیز ہے کہ جب انسان اس کی طرف آجاتا ہے تو پورے دین سے آسانی سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے بے شمار انبیاء اور رسل صرف اسی ایک مقصد کے لئے بھیجے کہ وہ لوگوں کو شیطان کے اس راستے سے ہٹائیں جو جہنم کی

طرف لے کر جاتا ہے اور انہیں اللہ کی عبادت اور توحید کے اس راستے کی طرف دعوت دیں جو جنت کی طرف لے کر جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ تک سب انبیاء کا یہی مشن تھا۔ اب آپ ﷺ کے بعد قیامت تک آپ ﷺ کی امت کے علماء اور صلحاء کی یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ اس مشن کو ادا کرتے رہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو یہی سمجھایا تھا کہ میں اللہ کا آخری نبی ہوں۔ اللہ کی آخری کتاب نازل ہوچکی۔ آج اللہ کا دین مکمل ہوچکا۔ میں نے وہ سارا دین تمہیں پہنچادیا، سمجھا دیا اور عمل کرکے دکھا دیا۔ اب میرا کام مکمل ہوگیا ہے۔ اب میرے بعد تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ گے۔ آپ ﷺ کے الفاظ تھے۔

فَلْيُبَلِّغْ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ پس جو موجود ہے، وہ اس کو پہنچانے کا فریضہ ادا کرے جو یہاں موجود نہیں۔

گویا کہ نبی ﷺ نے اس دین اور توحید کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کا مشن اپنی امت کو سونپ دیا۔ اب امت کے ذمے دعوت کا کام ہے۔

دعوت کیا ہے؟

دعوت سے کیا مراد ہے؟ دراصل دعوت کہتے ہی توحید کی دعوت کو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلانے کو ہی دعوت کہا جاتا ہے۔ اگر ہم اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ چاہے معیشت کا کوئی مسئلہ بیان کرنے لگیں تو اس کا آغاز اللہ کی توحید سے کرتے ہیں۔ وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ کی توحید میں انسان کا عقیدہ خراب ہوجاتا ہے تو پھر شرک کے آنے کی وجہ سے قوموں کی معیشت بھی تباہ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سیاست اور دیگر اجتماعی امور سے متعلق کوئی مسئلہ ہو یا انفرادی اخلاقیات و معاملات حتی کہ نکاح، طلاق سے متعلق

کوئی مسئلہ ہو تو امام ابن تیمیہؒ اللہ کی توحید سے ہی اس مسئلے کا حل بیان کریں گے۔ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہر چیز کی بنیاد اللہ کی توحید ہے۔ اور ہر بگاڑ کی بنیاد شرک ہے۔ جتنا لوگوں کے اندر شرک آتا جاتا ہے، اتنا ہی بگاڑ آجاتا ہے۔ اور اتنی ہی دنیا و آخرت میں انہیں تباہیاں اور بربادیاں نصیب ہوتی ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ بہت سے انبیاء ایسے گزرے ہیں کہ جن سے مختلف معاشرتی مسائل اس قدر ذکر نہیں ہوئے، صرف اللہ کی توحید کا ذکر ان سے ملتا ہے کیونکہ توحید مکمل دین ہے اور یہی ہمارے لئے سمجھنے کی بات ہے۔

طاغوت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾

[النحل : ۳٦/۱٦]

’’اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔‘‘

یہاں طاغوت سے مراد شیطان ہے اور یہ معروف شیطان ابلیس بھی ہے جو لوگوں کو اللہ کی عبادت سے ہٹانے کی باقاعدہ کوشش کرتا ہے۔ اللہ کے مقابلے میں اس نے اپنا ایک پورا نظام کھڑا کیا ہوا ہے۔ اس لئے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ نے طاغوت کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ’’طاغوت ہر وہ چیز ہے جو اللہ کے مقابلے میں ہو۔‘‘

یعنی ہر وہ چیز جو اللہ کے مقابلے میں مانی جائے، جو اللہ کے مقابلے میں تسلیم کرلی جائے، اس کو ایک قوت اور ایک نظام کے طور پر اللہ کے مقابلے میں مان لیا جائے تو وہ طاغوت ہے۔ طاغوت انسان بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلے میں خود ربّ بن

جائیں۔ اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنا حکم تسلیم کرائیں۔ اپنی آمریت قائم کرائیں، اسی طرح اللہ کے نظام اور دین کے مقابلے میں انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے نظام بھی طاغوت ہوتے ہیں چاہے وہ جمہوری نظام ہوں، سیکولر نظام ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام ہوں یا سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظام ہوں، جو بھی چیز ، انسان یا نظام اللہ کے مقابلے میں آئے گا، وہ طاغوت کہلائے گا۔ اس لئے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔ اسی طرح اللہ کے نبی ﷺ نے بھی یہی بات بتائی کہ ''تمام انبیاء بھائی بھائی ہیں اور ان کا ایک ہی دین ہے۔''

ان دونوں آیت اور حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک تھی اور وہ توحید کی دعوت تھی۔ آپ قرآن کا مطالعہ کریں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک تمام چیدہ چیدہ انبیاء کی دعوت پیش کی۔ ان سب کی ایک ہی دعوت نظر آئے گی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلاتے رہے۔ اس لحاظ سے ان سب کا دین ایک تھا۔

یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ دین میں شریعتیں تو بدلتی رہی ہیں۔ شریعت کے احکام میں اللہ تعالیٰ تبدیلیاں کرتے رہے ہیں۔ پہلے احکام کو منسوخ کرکے نئے احکام اللہ تعالیٰ دیتے رہے ہیں۔ لیکن دین کی بنیاد شریعت کے ایسے احکام پر نہیں تھی اور نہ ان احکام میں تبدیلیوں کی بنیاد پر تھی۔ دین کی بنیاد اللہ کی توحید پر ہے جو کبھی نہیں بدلی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾(آل عمران : ۱۸/۳، ۱۹)

'' اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا

کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کے ساتھ دنیا کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ خود گواہی دے رہے ہیں ، لا الہ الا اللہ کی شہادت خود اللہ تعالیٰ پیش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تمام فرشتے اور تمام اہل علم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ فرمایا ،اسی کا نام دین ہے۔ یہی اصل اسلام ہے کیونکہ توحید ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جب اس پر انسان کا ایمان پختہ ہوجائے تو پھر اللہ تعالیٰ دیگر شرعی امور میں جو بھی احکام لوگوں کو بدل بدل کر دیتا ہے، ان کے لئے ان پر چلنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔

دین میں توحید اور دیگر شرعی احکامات کی حیثیت اور تعلق:

توحید کو دین کی اصل بنیاد ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ بس صرف توحید پر ایمان لایا جائے اور دیگر شرعی احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ توحید کو اس لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے کہ اس پر ایمان لانے سے ہی انسان کے لئے باقی شرعی احکام پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ توحید ان احکام پر عمل کرنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔ اگر کوئی توحید کو تو ماننے کا دعویٰ کرے لیکن دیگر کسی شرعی حکم یا حلال حرام، نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل میں شریعت کی پاسداری کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو اسے اپنی توحید پر غور کرنا چاہئے۔ توحید تو انسان کو اللہ کی پوری شریعت پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار کرتی ہے۔ اگر انسان شریعت کو پوری طرح نہیں مان رہا تو یقیناً اس کی توحید میں ہی کوئی نقص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف شریعتوں میں جو احکام بدل بدل کر دیئے ، بعض

شریعتوں میں جو حلال ہوتا، وہ دوسری شریعتوں میں حرام کردیا جاتا، اسی طرح دیگر کئی اہم تبدیلیاں کی جاتی رہیں تو یہ کام لوگوں کے اس عقیدہ توحید کی آزمائش کے لئے کیا جاتا۔ جن کا اللہ پر ایمان پختہ ہوتا، عقیدہ توحید مضبوط ہوتا، وہ ان احکام میں تبدیلیوں پر بھی فوراً ایمان لاتے اور اسے اللہ کی حکمت اور مشیت سمجھتے اور جن کا عقیدہ توحید پر ایمان نہ ہوتا یا کمزور ہوتا تو وہ اعتراض کر بیٹھتے۔ اور یوں وہ اس آزمائش میں ناکام ہوجاتے۔

توحید کی عام طور پر تین قسمیں کی جاتی ہیں:

۱۔ توحید ربوبیّت۔ ۲۔ توحید الوہیّت ۳۔ توحید الاسماء والصفات

اس سے پہلے کہ ہم توحید الربّ یا توحید ربوبیّت پر بحث کریں، اس بات کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ توحید ربوبیت اور توحید الوہیت میں کیا فرق ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ توحید ربوبیت میں افعال اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں جبکہ توحید الوہیت میں افعال بندے کے ہوتے ہیں۔

توحید ربوبیت یہ ہے کہ اللہ کو اس کے تمام افعال میں ایک مانا جائے اور توحید الوہیت یہ ہے کہ بندے کے تمام افعال کو اللہ کے لئے خالص کر دیا جائے۔

اب ہم پہلے توحید ربوبیت کی وضاحت کریں گے:

توحید ربوبیّت:

جب ہم کہتے ہیں کہ توحید ربوبیت میں افعال اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں اور اللہ کو اس کے تمام افعال میں ایک ماننے کا نام توحید ربوبیت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں کسی دوسرے کو شریک نہ مانا جائے۔ اسے اپنے افعال میں ایک، یکتا اور لاشریک مانا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور سنتا ہے، اللہ تعالیٰ

پیدا کرتا ہے، پرورش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ایسے تمام افعال میں ضروری ہے کہ کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔

توحید ربوبیت یا اللہ تعالیٰ کے افعال دو چیزوں میں کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کی تخلیق میں اور دوسرے تدبیر میں۔ یعنی یہ ایمان رکھنا کہ یہ جس قدر کائنات ہے، سورج، چاند، تارے، زمین، آسمان اور ان میں موجود ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اسی طرح یہ ایمان رکھنا بھی ضروری ہے کہ کائنات کا سارا نظام چلانے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ سورج چاند کا اپنے مدار پر چلنا، دن رات کا آنا جانا، موسموں کا ہیر پھیر، بارش کا ہونا۔ غرض ایک ذرے میں ایٹم کے چھوٹے سے چھوٹے نظام سے لے کر پوری کائنات کے نظام کو چلانے والا اور اس کی خاص تدبیر کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ماننا توحید ربوبیت میں شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ ﴾ [الفاتحة]

''تمام تعریف اللہ ہی کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اور نبی ﷺ نے فرمایا:

« اَنْتَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ » [متفق علیه]

''تو ہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔''

مذکورہ بالا آیت وحدیث دونوں میں اللہ کیلئے رب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ رب ایسا جامع لفظ ہے جس میں پیدا کرنے اور تخلیق کرنے کا معنی بھی پایا جاتا ہے، پرورش کا معنی بھی پایا جاتا ہے اور نظام چلانے کا معنی بھی اس میں شامل ہے۔ ''ربّ'' اللہ تعالیٰ کی ایک جامع صفت ہے۔ اس لئے علمائے عقیدہ توحید ربوبیت میں تخلیق کو تدبیر کے

ساتھ اکٹھا بیان کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عقیدے میں ہمیشہ یہ بہت بڑا بگاڑ رہا ہے کہ لوگوں نے عام طور پر اس بات کو تو ہمیشہ تسلیم کیا ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز اللہ کی تخلیق اور اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے۔ تخلیق کو تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ ہی نے ساری کائنات اور سارا نظام پیدا کیا ہے لیکن اس نظام کی تدبیر اور اس نظام کار کو چلانے کا معاملہ وہ غیر اللہ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب کافروں کو یہ کہا جائے۔

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزمر: ٣٨]

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کئے تو وہ فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔''

تو گویا تخلیق میں لوگ اللہ کا انکار نہیں کرتے۔ لوگوں کو عموما بہت زیادہ غلط فہمی تدبیر کے معاملے میں رہی ہے۔

کائنات کی تدبیر کے معاملے میں ایک گمراہ کن فلسفہ یہ گھڑا گیا کہ اللہ نے یہ نظام کائنات ایک دفعہ بنادیا۔ اب یہ سارا سسٹم خود بخود چل رہا ہے۔ جب قیامت آئے گی تو اللہ اس کو سٹاپ کردے گا۔ اس چلتے ہوئے نظام کو ختم کردے گا اور اس کا نام قیامت ہوگا۔ ان فلسفیوں کے نزدیک پیدائش سے لے کر قیامت تک یہ سب نظام خود بخود چل رہا ہے اور تخلیق کے بعد اب اللہ کی تدبیر کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ ایسے گمراہ کن فلسفوں کی وجہ سے ہی علمائے عقیدہ ، توحید ربوبیت میں تخلیق کے ساتھ تدبیر کو بھی اکٹھا بیان کرتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ جس طرح شروع میں اللہ نے پیدا کیا تو اس کے بعد بھی قیامت تک جو کچھ پیدا ہوتا رہے گا، ان سب کا پیدا کرنے والا بھی اور ان کی شکل وصورت، رنگ، ماہیت اور صفات کا پیدا کرنے والا بھی

اللہ ہے۔ یہ سب کچھ محض خود بخود نہیں ہو رہا۔ کوئی بھی کام اللہ کی مشیت اور اختیار کے بغیر نہیں ہو رہا۔ قرآن مجید میں اللہ نے واضح طور پر اعلان کر دیا۔

﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا..... ﴾ [الانعام : ٥٩/٦]

''کوئی پتہ بھی گرے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔''

یعنی کائنات میں ہر آن جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، کوئی بھی حرکت ہوتی ہے حتی کہ ایک پتہ بھی گرتا ہے تو اللہ کے حکم اور اس کے اختیار اور اس کی تدبیر سے گرتا ہے، یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوتا۔

نظام کائنات کی تدبیر کے معاملے میں دوسرا گمراہ کن نظریہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ نے ایک بار یہ ساری کائنات اور سارا طے شدہ نظام بنا دیا۔ اس کے بعد اب جو بھی اس میں ہمہ وقت اور ہر آن تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں تو یہ تبدیلیاں اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ اب اس نظام میں تبدیلیوں اور تصرف کا اختیار اللہ نے دوسروں کو سونپ دیا ہے۔ تصرف کی کچھ قوتیں فرشتوں کو دے دی ہیں کہ فلاں فرشتہ جب چاہتا ہے، بارش برساتا ہے اور فلاں فرشتہ فلاں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض تصرفات اور امور کائنات کا کچھ انتظام وانصرام کرنے کا اختیار اللہ نے اپنے بعض منتخب اور محبوب بندوں کو دے رکھا ہے۔ صوفیاء میں اس بنیاد پر مختلف اولیاء کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ جس کو تصرف کا جتنا زیادہ اختیار ہوتا ہے، اسے اتنا ہی بلند درجہ اور لقب دیا جاتا ہے۔ غوث، قطب اور ابدال کو ان کے ہاں بڑے درجات ہیں اور ان کے عقیدہ کے مطابق یہ غوث، قطب اور ابدال ہی ساری کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اور وہ ان میں جو چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں اور تبدیلیاں لاتے ہیں۔

گویا یہ تو مانا گیا کہ کائنات کا نظام اللہ نے پیدا کیا اور یہ خود بخود بھی نہیں چل رہا

لیکن اس کائنات کو چلانے اور اس کی تدبیر کرنے کے اختیارات اللہ کی بجائے دوسروں کو سونپ دیئے گئے۔ یہ عقیدہ سراسر ہندوؤں اور مشرکوں سے لیا گیا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ پوری کائنات کو بنانے والا، اس کو پیدا کرنے والا اور اس کی تخلیق کرنے والا ایک ہی ہے۔ وہ کائنات کے اس خالق کو رام کا نام دیتے ہیں جو ان کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق رام نے یہ ساری کائنات، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، شجر، حجر غرض سب کچھ اس نے پیدا کیا اور ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد اب اس کا کام مکمل ہوگیا اور وہ آرام سے ایک طرف بیٹھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بارش، کھیتی باڑی، اولاد کی پیدائش، خوش بختی، نحوست اور دولت وغیرہ کے لئے الگ الگ دیویوں اور دیوتاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ کھڑا کردیا۔ اور اب جس کو جس قسم کی جو غرض ہوتی ہے، وہ اس قسم کی دیوی یا دیوتا کو اپنی حاجت برآری کے لئے پکارتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب تک فلاں غرض کے لئے فلاں دیوی یا دیوتا کو نہ پکارا جائے گا، اس کا کام نہیں ہوگا۔ یہی ملتی جلتی تقسیم افسوسناک طور پر ہمارے ہاں صوفیاء نے کی ہوئی ہے۔ کسی ولی اور بزگ کو اولاد کے حصول کے لئے مخصوص کیا ہوا ہے، کسی کو دولت اور کاروبار میں ترقی کے لئے، کسی کو بیماریوں میں شفاء کے لئے اور کسی کو کسی اور غرض کے لئے مخصوص کیا ہوا ہے اور اپنے ہر کام کے لئے ان بزرگوں کے مزاروں اور خانقاہوں کے الگ الگ طویل سفر کئے جاتے ہیں۔ وہاں غیراللہ کے نام پر نذریں نیازیں، چڑھاوے اور ہر وہ کام کیا جاتا ہے جو شرک وبدعت کے زمرے میں آتا ہے۔ کہنے کو ہم مسلمان کہلاتے ہیں لیکن سب مذہبی فلسفے ہندوؤں کے اپنائے ہوئے ہیں۔ عبادت کا شرکیہ رنگ ڈھنگ انہی کا اپنایا ہوا ہے۔ صرف اصطلاحات اور افعال کے نام اور چہرے بدلے ہوئے ہیں۔ جو

حیثیت ہندوؤں میں ان کے دیوی دیوتاؤں اور بتوں کو حاصل ہے، وہی حیثیت ہم نے اپنے ولیوں، پیروں اور ان کی قبروں کو دے دی ہے۔ اپنے بزرگوں سے سنی سنائی اور معاشرے میں چلی ہوئی رسموں کو اہمیت دیتے ہیں لیکن خود قرآن وحدیث کھول کر اسلام کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے اور نہ ان کے پیر اور مولوی اپنے عوام کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کی گدیاں اور ان کا خانقاہی کاروبار سب کچھ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بہر حال اب یہ بات ہمیں سمجھ آ گئی ہوگی کہ معاشرے میں اصل اسلام سے دوری کی یہ صورتحال صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے بھی ہندوؤں کے فلسفوں کے زیر اثر اللہ کو اس کائنات اور اس کے نظام کا خالق تو مان لیا لیکن اس کو مستقل چلانے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا نہ مانا ۔اس نظام کو چلانے کے اختیارات غیر اللہ کو سونپ دیئے۔ جبکہ ہمارا یہ ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ ساری کائنات کو پیدا بھی اللہ نے کیا ہے اور اسے چلا بھی وہی رہا ہے۔ نہ کسی کو پیدا کرنے میں اللہ کا کوئی شریک ہے اور نہ اس نظام کائنات کو چلانے میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی اللہ نے یہ نظام چلانے یا اس میں تصرف کرنے کا اختیار کسی کو دیا ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑے سے بڑا ولی، نبی اور پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

دو شبہات کا ازالہ

اللہ اور بندے کے اختیار میں فرق:

⊙ ایک شبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو بھی دنیا میں کچھ اختیار دیا ہے۔ اس لحاظ سے انسان بھی کچھ نہ کچھ اختیارات کا مالک ہے.....تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ دنیا میں انسان کے اس اختیار کی نوعیت آزمائش کی ہے۔ اور اس کا پھر قیامت کے

دن حساب بھی ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے دنیا میں تمہیں جو اختیار دیا تھا تو کیاتم نے اس کو استعمال کرتے ہوئے میرا راستہ اختیار کیا تھایا شیطان کا۔ اگر اللہ کا راستہ اختیار کیا ہوگا تو جنت کا حقدار بنے گا اور اگر شیطان کی راہ پر چلا ہوگا تو جہنم کے شدید ترین عذاب کا مستحق ہوگا۔ یہ اختیار وہ نہیں ہے جو اللہ کی تخلیق یا اس کے نظام کائنات میں تصرف کرنے والایا اس میں شریک ہونے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس کی ہر چیز ذاتی ہے۔ اس کی ذات میں، صفات میں ،اختیارات میں اور افعال میں کوئی شریک نہیں۔

⊙ ہمارے ہاں عام طور پر بزرگوں، پیروں ،ولیوں کے متعلق یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے کہ یہ جو ہماری مشکلیں حل کرتے ہیں ،ہمیں بیٹے دیتے ہیں، رزق یا کاروبار وغیرہ میں ترقی دیتے ہیں تو یہ اپنے ذاتی اختیار سے نہیں دیتے بلکہ اللہ نے انہیں اختیار دیا ہوا ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ ہم انہیں خدا تو نہیں کہتے لیکن یہ ہمارے لئے اللہ کے ہاں وسیلہ اور سفارشی ہیں۔ اب اگر ہم قرآن کھول کر دیکھیں تو ساری حقیقت واضح ہوجائے گی کہ یہی عقائد تو مشرکین مکہ کے بھی تھے۔ اللہ کو تو وہ بھی خالق اور رب مانتے تھے لیکن پھر بہت سے کاموں کی تدبیر کے اختیارات انہوں نے اپنے مختلف بتوں کو دیئے ہوئے تھے۔ یہ بت بھی ان کے پرانے نیک بزرگوں کے ہی مجسمے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے یہ بزرگ اور بت اللہ کے بڑے مقرب اور بڑے وسائل رکھنے والے ہیں۔ اللہ ان کی بات ٹال نہیں سکتا۔ وہ ہماری بھی رسائی کرادیں گے۔ ذرا قرآن کی یہ آیت ملاحظہ کیجئے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾

’’ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے۔ (وہ

اپنے اس فعل کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تک وہ ہماری رسائی کرادیں۔'' (الزمر: ۳/۳۹)

قرآن کی ایسی آیات اور احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی تخلیق اور اس کی تدبیر میں کوئی شریک نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا ولی، نبی اور پیغمبر بھی اللہ کی تخلیق اور اس کی تدبیر یا اختیارات میں تصرف نہیں کرسکتا۔ سب اختیارات اللہ کے پاس ہیں اور یہی توحید ربوبیت ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

توحید الوہیّت:

توحید الٰہ یا توحید الوہیت کو توحید العبادۃ بھی کہتے ہیں۔ توحید الوہیت کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں کہ'' بندے کے تمام افعال اور عبادات صرف اور صرف اکیلے اللہ کے لئے خاص ہوں، اس میں کوئی اور شریک نہ ہو۔''

یا آسان لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ''عبادت کو اللہ کے لئے خالص کرنا اور کسی کو شریک نہ کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝﴾[البقرة : ۱۶۳/۲]

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس رحمٰن ورحیم کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« فَلْيَكُنْ اَوَّلُ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ شَهَادَةَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ » [متفق عليه]

''پہلی چیز جس کی طرف تو لوگوں کو دعوت دے، اس بات کی شہادت ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

بخاری کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

« اِلَی اَنْ یُّوَحِّدُوا اللّٰہَ »

''یعنی سب سے پہلے اللہ کے ایک ہونے کی دعوت دی جائے۔''

اللہ کی عبادت میں زبانی، مالی اور جسمانی ہر طرح کی عبادات شامل ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ سے کہلوایا:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○﴾[الانعام: ۱۶۲/۶]

''کہو میری نماز، میرے تمام امور قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔''

توحید الوہیت ہمیں بتاتی ہے کہ تمام عبادات مثلاً دعا، ذبح نذر و نیاز، نماز، روزہ، حج اور قربانی صدقہ وغیرہ خالص اللہ کے لئے کی جائیں۔ کسی دوسرے کی رضا، عبادت یا خوشنودی اس میں شامل نہ ہو۔ دعا مانگی جائے تو صرف اللہ سے مانگی جائے۔ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کیا جائے کہ اللہ سے بھی مانگے اور اس کے ساتھ کسی اور کے واسطے یا وسیلے کو بھی شامل کرے۔ دعا اور ذکر اہم ترین عبادات ہیں۔ تمام عبادات اللہ ہی کے لئے خالص ہونی چاہئیں۔ اللہ ہی کا ذکر کیا جائے۔ کسی اور کے نام کے وظیفے نہ کئے جائیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو اسی طرح پکارا جاتا ہے جس طرح اللہ کو پکارنا چاہئے۔ تکلیف اور مشکل کے وقت بعض اللہ کے نیک بندوں سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یا غوث یا دستگیر ہماری مدد کیجئے۔ یا علیؓ ہماری مشکل حل کیجئے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر انہیں پکارنا اور ان سے مدد

طلب کرنا۔ بعض لوگ فرشتوں کا نام لے کر انہیں مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ یہ چیزیں توحید الوہیت کے منافی ہیں۔ اسی طرح جسمانی عبادات میں نماز اور طواف وغیرہ اللہ کے لئے خالص ہو۔ قیام، رکوع اور سجدہ وغیرہ کی کوئی حالت غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ بعض لوگ احتراما بڑوں کے لئے قیام کی حالت اختیار کرتے ہیں۔ قومی ترانے کے لئے قیام کرتے ہیں اور بعض لوگ کسی بڑے کی موت کی خبر پر احتراماً قیام کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی تمام کیفیات غلط ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسے قیام نہ کرو جیسے عجمی لوگ قیام کرتے ہیں۔ دور جاہلیت میں بڑوں کے لئے قیام کیا جاتا تھا۔ اکثر لوگ یہ کہہ کر گنجائش نکالتے ہیں کہ ہم عبادت سمجھ کر تو نہیں کرتے۔ حالانکہ نبی ﷺ نے عجمیوں کی مشابہت سے منع کیا ہے۔ کیا ہم تصور کر سکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کسی کے لئے عبادات کا قیام کر سکتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ صحابہؓ کے بارے میں ایسا گمان نہیں ہو سکتا۔ لیکن غور کرنے والی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو عجمیوں کے قیام کی مشابہت سے روکا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ عبادت کا نقطہ نظر نہ بھی ہو، پھر بھی کفار کی مشابہت سے بچنا چاہئے۔ بعض وکلاء اور قانون دان طبقے کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ وہ بڑے جج کے سامنے آتے وقت جھکتے ہیں، پھر کھڑے ہوتے ہیں اور بات کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہ صریحاً انگریز کی مشابہت ہے۔ ان کے ہاں عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے جج کو قانون کی علامت سمجھ کر اس کے لئے قیام بھی کیا جاتا ہے اور رکوع بھی۔ جبکہ اسلام میں ایسا تصور ہرگز نہیں ہے۔ سب اللہ کے بندے ہیں، سب اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، کوئی انسان اللہ کے حکم کی علامت بن کر اس حیثیت پر فائز نہیں ہوتا کہ اس کے سامنے جھکا جائے۔ ایسا کرنا باطل ہے۔ اسی طرح قبروں وغیرہ پر

سجدہ کی کوئی شکل جائز نہیں۔ قبر پر سجدہ شرک ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم عبادت کا سجدہ نہیں کرتے۔ تعظیمی سجدہ کرتے ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا چاہئے کہ امت محمد ﷺ میں تعظیمی سجدہ بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے۔ ذبح، قربانی اور نذرونیاز وغیرہ بھی صرف اللہ کے لئے ہونے چاہئیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ذبح کرتے وقت یا نذر نیاز دیتے وقت یہ نیت رکھی جائے کہ یہ اللہ کے لئے بھی ہے اور ہمارے فلاں بزرگ، پیر یا فقیر وغیرہ کے نام کی بھی ہے جیسے ہمارے معاشرے میں عموما یہ کہا جاتا ہے نذر اللہ نیاز حسینؓ۔ یعنی نذر تو اللہ کے لئے لیکن نیاز حسینؓ کی ہے حالانکہ نذر اور نیاز دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ گویا ہم اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں چیز اللہ کے نام کی نذر بھی ہے اور حسین رضی اللہ عنہ کے نام کی بھی ہے۔ اسی طرح گیارہویں والے پیر کے نام کی نذر دی جاتی ہے اور دیگر پیروں ولیوں کے نام پر بھی نذر و نیاز اور صدقے وغیرہ کئے جاتے ہیں۔ سیاہ رنگ کے بکرے چھترے خصوصی طور پر پیروں کے نام پر صدقہ کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عقیدے کی اس غلطی کو بیان کرتے ہوئے شرک میں مبتلا لوگوں کا طرز عمل واضح فرمایا:

﴿ فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا..... ﴾ [الانعام: ۱۳۶/۶]

''وہ بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے مشرکانہ عمل کا انجام بیان کرتے ہوئے ان پر واضح کر دیا کہ جو کچھ بھی پیش کرنا ہے، نذر کرنی ہے، صدقہ کرنا ہے یا نیاز دینی ہے، سب کچھ صرف اور صرف خالص اللہ کے لئے پیش کرو۔ اگر کچھ اللہ کے لئے پیش کرنا ہے اور کچھ غیر اللہ کے لئے تو اللہ نے فرما دیا کہ پھر تم سب کچھ لے جاؤ۔ مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ مجھے تمہاری ایسی کوئی چیز پہنچتی ہے۔

فرمایا:

﴿..... فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَائِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝﴾ [الانعام: ۱۳۶/۶]

''پھر جو چیز ان کے شریکوں کے لیے ہوتی ہے، وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کے لیے ہوتی ہے، وہ ان کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ کیا ہی برے فیصلے وہ کرتے ہیں۔''

گویا اللہ نے واضح کردیا کہ جو بھی عبادت کرنی ہے، جو بھی عمل پیش کرنا ہے تو وہ خالص میرے لئے پیش کرو..... اگر دوسروں کے لئے بھی کرنا ہے اور میرے لئے بھی کرنا ہے تو پھر اللہ کہتے ہیں کہ سب کچھ دوسروں کے لئے ہی کرو۔ میرے لئے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف وہ عمل قبول کروں گا جو صرف اور صرف خالص میرے لئے کیا جائے۔ اسی چیز کا نام توحید الوہیت ہے۔

توحید ربوبیّت اور توحید الوہیّت کی دلیل ہے:

چونکہ توحید ربوبیت میں افعال اللہ کے ہوتے ہیں اور ان میں اللہ کے شریک کی نفی کی جاتی ہے اور توحید الوہیت میں بندے کے تمام افعال کو اللہ کے لئے خالص کیا جاتا ہے، اس لئے توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار یہی اسلوب دعوت اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے اللہ کا خالق، مالک اور رازق ہونا پیش کیا جاتا ہے اور بار بار توجہ دلائی جاتی ہے کہ جب سب کچھ پیدا کرنے والا اللہ ہے تو پھر ساری عبادتیں خالص اللہ کے لئے کیوں نہ ہوں۔ جب خالق و مالک اور رازق اللہ ہے تو عبادت اللہ کے غیر کے لئے کیوں ہو۔ بیشتر مکی سورتوں میں یہ اسلوب دعوت اختیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ النمل میں متعدد آیات کی

وضاحت موجود ہے:

﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَاكَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ○ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ مَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○﴾ [النمل : ٦٠تا٦٣]

''بھلا بتاؤ تو کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کس نے آسمان سے بارش برسائی؟ پھر اس سے ہرے بھرے بارونق باغات اگا دیئے؟ ان باغوں کے درختوں کو تم ہرگز نہ اگا سکتے، کیا (ان کے بنانے میں) اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود بھی ہے؟ (نہیں نہیں) بلکہ یہ لوگ کج رو ہیں۔ کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں جاری کردیں اور اس کے لئے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان روک بنادی، کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود بھی ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر کچھ جانتے ہی نہیں۔ بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کرکے سختی کو دور کردیتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے۔ تم بہت کم نصیحت وعبرت حاصل کرتے ہو۔ کیا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ دکھاتا ہے اور جو اپنی رحمت سے پہلے ہی خوشخبریاں دینے والی ہوائیں چلاتا

ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے جنہیں یہ شریک کرتے ہیں ، ان کے شرک سے اللہ بلند وبالاتر ہے۔''

مکہ کے مشرکین ربوبیت میں توحید کو مانتے تھے جبکہ الوہیت میں شرک کرتے تھے۔ اس لئے قرآن نے توحید الوہیت کو بہت وضاحت سے پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اصل مقصود توحید الوہیت ہے۔ تمام انبیاء اسی توحید کو واضح کرنے اور پیش کرنے آئے تھے اور قوموں نے نبیوں سے اختلاف الوہیت کے مسئلے پر کیا۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ کی بنیاد توحید الوہیت پر ہے۔ یہی تمام انبیاء کا منہج ہے۔ دعوت کا اصل ہے اور اسی کے قیام کے لئے جہاد ہے۔

توحید..... سب سے زیادہ حساس مسئلہ :

عبادت میں توحید اور شرک کا مسئلہ سب سے زیادہ حساس ہے۔ قرآن حکیم نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ نکھارا ہے۔ دوسرے مسئلہ میں قرآن عموماً اصولی راہنمائی دیتا ہے اور تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں لیکن توحید خصوصاً توحیدِ عبادت کے مسئلے میں جزئیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ توحید میں ذرا سی جھول بھی بڑی بڑی غلطیوں کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جمیع مسائل وامور شریعت کا دارومدار توحید خصوصاً توحید الوہیت پر ہے اور تمام خرابیوں کی جڑ شرک ہے۔ اسی لئے تمام انبیاء کی دعوت میں پہلا اور بنیادی مسئلہ توحید کی دعوت تھی۔ جب قوموں کو توحید سمجھ آ جاتی تو انہیں پورا دین سمجھانا آسان ہوتا اور دین پر عمل دشوار نہ رہتا۔ توحید پر ہی لوگ متحد ہوتے ہیں اور قوت بنتے ہیں۔ ماضی میں قوموں میں بگاڑ اس مسئلے پر آیا اور توحید چھوڑ کر شرک اختیار کرنے کی وجہ سے قوموں پر عذاب آئے۔ آج بھی اصل مسئلہ توحید ہی ہے۔ قرآنی حکمتیں اختیار کر کے توحید کی دعوت پہنچائی جائے اور سمجھائی جائے۔

مسئلہ توحید سمجھنے اور سمجھانے میں بہت آسان ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قرآنی دلائل اور نبوی ﷺ اسلوبِ دعوت کو اختیار کیا جائے۔ مخاطب دعوت کا صحیح احاطہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں صحیح معلومات ہوں۔ اسے کیا شکوک ہیں؟ ان کے جواب کے لئے کیا دلائل ہیں؟ دلیل کی قوت، اخلاق اور حکمت، اسلوب دعوت میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت مسلم معاشرے میں توحید کا مسئلہ عام لوگوں کے ہاں واضح نہیں ہے۔ اکثر لوگ بے خبر ہیں۔ دعوت کی شدید کمی ہے۔ لوگ توحید کی بنیادی چیزوں کو ماننے کے باوجود بے خبر ہیں اور شرک کی بہت سی آمیزش بے خبری یا غلط فہمی کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ اس صورت حال میں داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ کلمہ گو لوگوں کو کافر ومشرک کے فتوے لگا کر بھگانے یا بدکانے کے بجائے انہیں دلائل کے ساتھ سمجھائے۔ لوگ توحید کو مانتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ جب دلائل اور اسلوب حکمت کے ساتھ سمجھایا جائے تو فوراً مان لیتے ہیں۔ الا ما شاء اللہ

یہ تجربہ شدہ بات ہے کہ عام آدمی قرآن وحدیث کے دلائل سے بہت جلد قائل ہوجاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسی اسلوب کو اختیار کریں اور دعوتِ توحید کو عام کریں۔

شبہے کا ازالہ

عقیدۂ توحید کو سمجھنے سمجھانے میں ایک بڑے شبہے کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر ''مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کے قرآنی الفاظ کو خاص طریقے سے بیان کرکے یہ گنجائش نکالی جاتی ہے کہ انبیاء، صلحاء، فرشتے اور دیگر اللہ کے برگزیدہ بندے ''مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کے ضمن میں نہیں آتے۔ مکہ کے مشرکین نے پتھروں کے جو بت تراش رکھے تھے، وہی ''مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' ہیں۔ گویا کہ اگر کسی نبی یا نیک بندے کے نام کا ورد وظیفہ کیا جائے یا ان

کے نام کا صدقہ دیا جائے تو اس میں ان کے مطابق حرج اس لئے نہیں کہ وہ نبی یا ولی غیر اللہ نہیں بلکہ وہ تو اللہ کے مقرب ہیں لہٰذا ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہ ''میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف شبہ ہے۔ اگر جان بوجھ کر کوئی ایسا کہتا ہے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ اپنے اور دوسروں کے عقیدے کی فکر کرنا چاہئے اور قرآن کے الفاظ اور اصطلاحات کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ اس پر بہت بڑی وعید ہے۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں '' مِنْدُوْنِ اللّٰہِ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اصلاح ہوسکتی ہے۔ سورہ التوبہ میں ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○﴾

[التوبة :۹/ ۳۱]

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے۔اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو صرف اسی قدر حکم تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں جبکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ (اللہ) پاک ہے ان چیزوں سے جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔''

آیت مذکورہ سے یہ بات واضح ہے کہ ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ '' سے مراد بت نہیں۔ قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ خود بیان کر رہے ہیں کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے علماء ومشائخ کو رب بنا رکھا تھا۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین جو روایات لائے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب اپنے علماء ومشائخ کے حکم کو حلال وحرام میں دلیل مانتے تھے۔ یہ اختیار صرف اللہ کا ہے کہ جسے چاہے وہ حلال کہہ دے یا حرام قرار دے دے۔ انہوں نے بزرگوں اور علماء کو اس مقام پر فائز کردیا تھا تو یہاں ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ،، کے الفاظ ان کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں مسیح علیہ السلام کو بھی

"مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" میں شامل کیا گیا ہے۔

اسی طرح سورہ المائدۃ میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ ﴾ [المائدۃ : ۱۱۶/۵]

''اور یاد کرو جب اللہ کہے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود قرار دے لو تو وہ عرض کریں گے کہ اے اللہ تو پاک ہے۔ یہ میرے لئے روا نہیں کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو تجھے ضرور معلوم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ بلاشبہ تو ہی غیب کی باتیں جاننے والا ہے۔''

مذکورہ آیت میں "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کے الفاظ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اس مسئلے کی اور بھی وضاحت ہوجاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ولٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ○ ﴾ [آل عمران : ۷۹]

''کسی انسان کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن

جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ اللہ کے عبادت گزار بن جاؤ اس لئے کہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے کہ تم کتاب کو پڑھتے ہو۔ اور نہ وہ یہ کہے گا کہ تم فرشتوں اور انبیاء کو رب سمجھو۔ کیا وہ تمہیں کفر کی تلقین کرے گا بعد اس کے کہ تم اسلام قبول کر چکے ہو۔''

آیت مبارکہ کی تفسیر میں جو روایات ثابت ہیں کہ نجران سے ایک وفد خاتم النبیین محمد ﷺ کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے بہت سی باتیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھیں۔ کچھ لوگوں نے یہ سوال کیا کہ جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی پرستش کی تو کیا آپ کی پرستش بھی کی جائے تو نبی ﷺ نے فرمایا، معاذ اللہ ہم ایسا نہیں کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہاں بھی '' مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ '' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں گویا کہ کسی نبی کی بھی عبادت نہیں ہوسکتی۔ یہ حق صرف رب العالمین کا ہے۔ اگر کسی نبی کو عبادت کے لئے پکارا جائے گا تو وہ بھی ''مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ '' میں شامل ہوگا۔ اگلی آیت میں مزید وضاحت کے طور پر فرشتوں کا نبیوں کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء، اولیاء اور فرشتوں میں سے کسی کی طرف کسی قسم کی عبادت کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ بزرگوں کی نیکی، تقوی اور درجات کی بلندی کی وجہ سے انہیں اللہ کے سوا عبادت کے لائق نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر کسی نبی، ولی، فرشتے کو سجدہ کیا جائے یا ان کے نام کا ورد وظیفہ کیا جائے یا ان کے نام کا صدقہ اور نذر ونیاز کی جائے تو اس کا کوئی جواز یہ کہہ کر پیش نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بندے اللہ کے مقرب ہیں۔ اللہ نے قرآن میں بار بار یہ واضح کیا ہے کہ اللہ کے مقرب بندے اللہ کی عبادت میں شریک نہیں۔ سب کو من دون اللہ میں شامل کرکے اللہ نے حقیقت واضح کردی ہے۔ جہاں تک اہل مکہ کے بتوں کا تعلق ہے جنہیں '' مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ '' سے مراد سمجھا گیا ہے، وہ بھی

بزرگوں اور نبیوں اور ولیوں سے منسوب تھے۔ پتھر کی مورتیاں کوئی چیز نہیں۔ ہمیشہ ان کے پیچھے اہم شخصیات رہی ہیں۔ آج بھی وہ قومیں جو مورتیوں کو پوجتی ہیں، وہ مورتیوں کو شخصیات سے وابستہ کرکے ان سے قصے کہانیاں منسوب کرتی ہیں۔

افغانستان میں بت ٹوٹے تو اہل کفر نے طوفان اٹھا دیا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بت گوتم بدھ کے تھے۔ صرف پتھر کی مورتی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اصل اہمیت گوتم بدھ کی سمجھی جاتی ہے۔ جب اس کے نام کے بت ٹوٹے تو کافروں کے مشرکانہ جذبات بھڑکے، اس سے ساری حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔ نبی ﷺ نے بیت اللہ سے نکال کر جو بت توڑے تھے، وہ جدّ الانبیاء ابراہیم علیہ السلام اور دیگر صالحین عرب کے ناموں سے منسوب تھے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ من دون اللہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جسے اللہ کا شریک بنایا جائے۔

توحید الاسماء والصفات:

قرآن حکیم میں ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ [الاعراف : ۱۸۰]

''اور اللہ کے لئے اچھے اچھے نام ہیں۔ ان کے ساتھ اسے پکاریئے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ [الروم ۲۷]

''اور اللہ کے لئے اعلیٰ صفت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں (صحیح بخاری) چنانچہ توحید الاسماء

والصفات سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ناموں اور اس کی صفات کو حقیقت جان کر من وعن اقرار کرنا اور کسی کو اللہ کے کسی نام یا صفت میں شریک نہ کرنا۔

اللہ کے ناموں میں سے چند ایک یہ ہیں "اَللّٰهُ ، اَلرَّحْمٰنُ، اَلرَّحِيْمُ، اَلْغَفُوْرُ ، اَلْعَزِيْزُ، اَلْقَدِيْرُ، اَلسَّمِيْعُ ، اَلْبَصِيْرُ.

اللہ کے سب نام اعلیٰ ہیں۔ ہمارا ایمان ہونا چاہئے کہ لفظ اور معنی ہر اعتبار سے اللہ کے نام سب سے اچھے ہیں۔ ہمیں اللہ کے ناموں کیلئے وہی لفظ استعمال کرنے چاہئیں جو اللہ نے اپنے لئے یا رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے لئے استعمال کئے ہیں۔

اللہ کے نام اللہ کی صفتیں بیان کرتے ہیں:

اللہ کی صفات کے بارے میں ہمارا ایمان یہ ہونا چاہئے کہ مخلوق کی کوئی صفت اللہ کی صفت جیسی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ اگر کسی اور کی کوئی صفت اللہ جیسی ہو تو یہ اللہ کے لئے نقص ہے۔ اللہ کی تمام صفات جنہیں اللہ نے اور رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے، ہمیں ان سب کا اقرار کرنا چاہئے۔ کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اقرار کرنا چاہئے کہ اللہ کی تمام صفات اسی طرح ہیں جس طرح اللہ کی ذات کے لائق ہیں۔ فلسفوں اور علم کلام کے ماہرین نے غلط روش اختیار کرتے ہوئے اللہ کی صفات کو انسانی علوم کے دائرے میں لاکر سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اللہ کے ناموں اور اس کی صفات کے معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف وحی کا علم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء کے بارے میں انسانی علم مثالوں کا علم ہے۔ انسانوں کے ذہنوں میں کسی کی ذات یا اس کی صفات سمجھنے کے لئے مثالیں موجود ہوتی ہیں۔ جب کسی کا نام آئے تو انسان فورا

ذہن میں موجود مثال یا شکل سے اس کی ہیئت وکیفیت سمجھ لیتا ہے۔ یہ اصول مخلوق کیلئے تو ہے کیونکہ انسان اشیاء کو دیکھتے ہیں یا ان کے بارے میں ہیئت کی باتیں سن کر ایک شکل بنا لیتے ہیں جبکہ اللہ کیلئے ایسا نہیں ہے۔ اللہ کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اپنے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہی صحیح علم ہے۔ اسی پر ایمان ضروری ہے۔ عقلی علوم سے کام لینے والوں نے وحی کو چھوڑ کر اپنے علمی قاعدوں سے اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں سمجھنے کی کوشش کی ہے جو کہ صریح جہالت اور گمراہی ہے۔

گمراہ فرقوں میں سے بعض نے اللہ کی صفات کا مطلق انکار کردیا اور جو الفاظ اللہ کی صفات کیلئے بیان ہوئے، ان کی تاویلیں کی ہیں۔ انہوں نے کھلی تحریف کی ہے جیسے جہمیہ کا طبقہ معروف ہے اور معتزلہ بھی عقلی تاویلات سے صفات کو بگاڑتے رہے۔ اس کے لئے عقائد کی کتب میں تعطیل کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور جہمیہ اور معتزلہ کو معطلہ کہا گیا۔ علاوہ ازیں دوسرا وہ طبقہ تھا جس نے اللہ کی تشبیہ بیان کی ہے جیسے الکرامیہ اور الرافضہ ہیں۔ اس طبقہ کے لوگوں نے اللہ کے لئے مثالیں بیان کی ہیں جبکہ اللہ کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی جیسا ہے۔ اسی طرح ایک طبقہ وہ ہے جس نے اللہ کی صفات کی کیفیت یعنی حالت بیان کی ہے جیسے الھشامیہ فرقہ ۔ گویا کہ جن لوگوں نے مثال یا تشبیہ یا کیفیت بیان کی ہے، انہوں نے اضافہ کرکے زیادتی کی ہے اور جن لوگوں نے تشبیہ اور کیفیت سے بچنے کے لئے صفات کا ہی انکار کردیا، انہوں نے انکار کرکے زیادتی کی ہے۔ عقیدہ میں صحیح منہج ان لوگوں کا ہے جو اللہ کے اسماء وصفات کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے پابند رہے..... جو اسماء وصفات میں گمراہ ہوئے، ان کی بنیادیں عموما

درج ذیل ہیں:

ا۔تحریف

تحریف سے مراد یہ ہے کہ اسماء او رصفات کے لئے جو الفاظ یا معنی کتاب وسنت میں بیان ہوئے ہیں انہیں تبدیل کردیا جائے جس سے مراد بدل جاتی ہے۔

مثلاً جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کلام نہیں کرتا تو انہوں نے قرآن کی آیت ''﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝﴾ (النساء۔۱۶۴) یعنی اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، میں تحریف کرکے اعراب کو بدل دیا ''كَلَّمَ اللّٰهَ ''میں نصب کے ساتھ یہ معنی بنا دیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا۔ پیش کو زبر کے ساتھ بدل کر معنی تبدیل کردیا۔ اسی طرح ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ (طہ۔ ۵)''یعنی رحمٰن عرش پر بلند ہوا'' کو تحریف کرکے اللہ کے استوی یعنی بلند ہونے کی صفت کو بدل کر استیلاء کہا جس سے معنی یہ بن گیا کہ اللہ کا عرش پر قبضہ ہے۔ اسی طرح '' جَاءَ رَبُّکَ '' یعنی تیرا رب آئے گا، کو بدل کر کہا کہ جَاءَ اُمْرُ رَبِّکَ یعنی جب تیرے رب کا حکم آئے گا۔ گویا کہ الفاظ یا اعراب کو تبدیل کرکے معنی تبدیل کردیا۔

یہ یہودیوں کی خصلت تھی۔ یہود نے اللہ کی شریعت کو تحریف کرکے بالکل بدل دیا۔ امت مسلمہ میں گمراہ فرقوں نے بھی اسی طرح تحریف کا کام کیا خاص طور پر اللہ کی صفات کو تحریف کا نشانہ بنایا۔

ب۔تعطیل

تعطیل سے مراد اللہ کی صفات کا انکار کرنا۔جہمیہ اور معتزلہ اور ان جیسے بہت سے گمراہ فرقوں نے اللہ کی صفات کا انکار کیا اور معطّلہ کہلائے۔ معطلہ کا گمان یہ ہے کہ

اللہ کی صفات کو مان کر کوئی شکل بنانی پڑے گی مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ عرش پر ہے تو لازماً یہ سمجھنا ہوگا کہ اللہ عرش سے بڑا ہے یا عرش بڑا ہے یا دونوں برابر ہیں۔ اس لئے انکار کردو۔ حالانکہ اللہ نے کوئی شکل بیان ہی نہیں کی۔ غلطی ان کی یہ ہے کہ پہلے وہ خود شکل بناتے ہیں۔ پھر شکل سے بچنے کیلئے انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اللہ کے سننے اور دیکھنے کی صفت پر تنقید کرتے ہیں اور صفات کے لئے جو الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں، ان کی تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں لفظ ''یَدُ اللّٰہِ '' یعنی اللہ کا ہاتھ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ نعمت یا قدرت لیتے ہیں۔ تاویل کرنا ان کا عام طریق ہے۔

ج۔ تمثیل یا تشبیہ:

اسماء وصفات الٰہیہ میں بڑی واضح گمراہی یہ بھی ہے کہ اللہ کی صفات کو دوسروں جیسا قرار دیا جائے۔ اس جیسی شکل یا شبیہ بیان کی جائے۔ نصاری میں یہ غلو پایا جاتا تھا کہ انہوں نے اللہ کی شبیہ بیان کی۔ انہوں نے کہا عیسی علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور گمراہ ہوئے۔

د۔ کیفیت یا حالت بیان کرنا:

گمراہ فرقوں میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ کی ہیئت یا کیفیت بیان کی ہے، مثلاً الھشامیہ نے کہا کہ اللہ کا طول وعرض برابر ہے (معاذ اللہ) گویا کہ کسی معین شکل کو بیان کرنا اس چیز کی کیفیت کو بیان کرنا ہے۔ جب اللہ نے کیفیت بیان نہیں کی تو اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ کیفیت سے بحث کی جائے۔

مثلاً یہ بیان ہوا کہ اللہ عرش پر ہے لیکن یہ بیان نہیں ہوا کہ کس کیفیت یا حالت

میں تو اس پر ایسے ہی ایمان رکھنا چاہئے کہ اللہ عرش پر ہے اور کیفیت بیان نہیں ہوئی تو اس پر بحث ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی بحث کرے گا تو حالت پر بحث کرے گا۔ اس سے انکار کی راہیں کھلتی ہیں۔

تفویض:

تفویض سے مراد یہ ہے کہ الفاظ کے معنی بیان نہ کئے جائیں ۔ انہیں اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔بعض لوگوں نے اللہ کی صفات کے لئے جو الفاظ بیان ہوئے ہیں، ان کا کوئی معنی مراد ہی نہیں لیا اور کہا کہ غلطی سے بچنے کے لئے ہم معنی ہی نہیں کریں گے۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے معانی بیان کئے ہیں۔ معانی بیان نہ کرکے غلطی سے بچنے کی بات کرنا محض واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معانی مراد نہ لینے سے بھی تاویلات کے دروازے کھلتے ہیں۔ جن لوگوں نے معانی نہیں کئے ،انہوں نے معطّلہ کی طرح تاویلات کے دروازے کھولے، بلکہ بڑی گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ ہم ''ید'' کا معنی ہاتھ کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں کہتے کہ اللہ کا ہاتھ فلاں جیسا ہے۔ جب اللہ کی کوئی مثال ہے ہی نہیں، تو اس کا تخیل بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ اس پر بحث ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان ہے لیکن کیفیت بیان نہیں کی گئی۔ اس لئے ہم بیان نہیں کرتے۔ ہم معنی کرتے ہیں، انکار بھی نہیں کرتے اور نہ ہی تشبیہ یعنی اس کی مشابہت بیان کرتے ہیں۔ نہ ہی خیال میں کوئی شکل لاتے ہیں کیونکہ خیال کرنے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ معلومات ضروری ہیں۔ جبکہ اس بارے میں معلومات دی ہی نہیں گئیں۔ اس لئے خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔بس ایمان رکھتے ہیں۔

عقیدۂ سلف

سلف اہل السنۃ والجماعۃ اھل الحدیث کے ہاں اللہ کے اسماء والصفات کے بارے میں واضح عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لئے اور اس کے رسول ﷺ نے اللہ کے لئے جو نام اور صفتیں بیان کی ہیں، ہم انہیں اسی طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ کی ذات کے لائق ہیں۔ اللہ کی ذات کے لائق کیا ہے؟، وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ نے جتنا علم اپنے نبیوں اور کتابوں کے ذریعے انسانوں کو بتا دیا ہے، یہی علم کے حصول کا صحیح ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہم تحریف وتعطیل یا تمثیل نہیں کرتے۔ ہم اللہ کی تمام صفات کو جس طرح اس کی ذات کے لائق ہے، تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ کی ذات اور صفات ہر نقص اور عیب سے پاک ہیں۔

اثبات اور نفی میں ہمارا منہج وہی ہے، جو کتاب وسنت میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً

﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾

[الشوری : ۱۱]

’’ہم اللہ کے سمیع اور بصیر ہونے کا اثبات کرتے ہیں لیکن اس بات کی نفی کرتے ہیں، کہ اس کی مثل کوئی ہو۔ اور صفات الٰہیہ کا اسی طرح اثبات کرتے ہیں جس طرح قرآن وسنت نے بیان کیا ہے مثلاً ۔﴿ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴾ [طه : ۷]

یعنی وہ پوشیدہ اور مخفی بات کو جانتا ہے۔

وہ علیم ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ ہر آن ہر حکمت کو جانتا ہے۔ وہ

عرش پر ہے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ رات کے آخری پہر آسمان دنیا پر آتا ہے۔ اللہ کلام کرتا ہے۔ اللہ ہر حاجت مند کی دعا وپکار کو سنتا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر وقت دیکھتا ہے۔ وہ پہلے بھی جانتا ہے اور بعد میں جو کیفیت ہو، اسے بھی جانتا ہے۔ وہ پہلے سے قدرت رکھتا ہے اور اپنی قدرت کے ساتھ جس چیز کو جس طرح چاہے، جب چاہے بدلتا ہے۔ وہ تدبیر کرتا ہے۔ ہر وقت، ہر چیز کو جیسے چاہے چلاتا ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے، مارتا ہے، بارش برساتا ہے۔ کھیتیاں اگاتا ہے، وہ حکم دیتا ہے اور بندوں کے اعمال قبول کرتا ہے۔

اللہ کی صفات ذاتی بھی ہیں اور فعلی بھی ہیں۔ اللہ کی ذاتی صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں مثلاً اللہ کے ہاتھ ہیں اور اللہ کا چہرہ ہے۔ اللہ کا علم اور قدرت اور ارادہ بیان ہوئے ہیں اور فعلی صفات میں اللہ کا عرش پر ہونا، آسمان دنیا پر اللہ کا نزول، اللہ کا پیدا کرنا اور سب کو رزق دینا بیان ہوا ہے۔

اللہ کی صفات کا انکار کرنے والے فرقوں جہمیہ وغیرہ نے اللہ کی ذاتی اور فعلی صفات کا انکار کرکے تاویلیں کیں اور اللہ کے ہاتھ، ارادہ اور استویٰ اور نزول کی نفی کی اور اشاعرہ اور ماتریدیہ نے بعض ذاتی اور معنوی صفات کو مانا لیکن فعلی صفات کی تاویل کی یعنی اللہ کے عرش پر ہونے کی تاویل کی جبکہ سلف نے بغیر تاویل کئے تسلیم کیا کہ اللہ عرش پر ہے کیونکہ قرآن کی متعدد آیات میں صریحاً بتایا گیا ہے کہ اللہ عرش پر ہے۔ انہوں نے اللہ کی ذاتی اور فعلی تمام صفات کا اقرار کیا۔ جو صفات اللہ کی ذات کے لائق ہیں، ان کے ساتھ اللہ کو متصف کیا اور جو چیزیں اللہ کی ذات کے لائق نہیں ہیں مثلاً اونگھنا اور نیند کرنا ،ان چیزوں سے اللہ کی ذات کو پاک قرار دیا اور اللہ کے لئے ہر نقص کی نفی کی۔ جس نقص اور عیب سے اللہ نے اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو پاک

قرار دیا۔ اور بنیاد وحی الٰہی کو بتایا۔ سلف نے اللہ کی تمام صفات کو مانا، کسی کا انکار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی شریعت کا پابند رکھا۔ عقل کے زور پر کسی کا رد نہیں کیا اور نہ ہی عقل کی وسعتوں سے کسی کا اقرار کیا۔ انہوں نے مثالوں کے منطقی نظریئے کو اختیار نہیں کیا۔ اس لئے دونوں طرف کی گمراہیوں سے بچ گئے۔ انکار کرنے والوں نے کہا کہ اقرار سے تشبیہ یا مثال ماننا پڑے گی اور مان کر غلطی کرنے والوں نے وحی کو چھوڑ کر فلسفی قاعدے استعمال کئے اور عقل کے دائرے کھینچتے رہے اور کہتے رہے کہ عقل سے حاصل ہونے والے علم کے بغیر یقین حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے شکلیں بیان کرتے رہے۔ یہ سب گمراہی کے راستے تھے۔ ان راستوں سے الحاد اور شرک آیا۔ جیسے یہود ونصاریٰ کے گمراہ عقائد کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوئیں ،وہی نتیجہ فرق باطلہ کے عقائد سے سامنے آیا۔ یہود نے اللہ کی صفات کا انکار کیا۔ الحاد کی بنیاد رکھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تحریفات کے ذریعے وہ اللہ کی شریعت کے باغی ہوگئے۔ اور نصاریٰ نے غلو کیا۔ مخلوق کو اللہ کے مشابہہ قرار دیا۔ عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا، اللہ کی مثل قرار دیا اور شرک کے مرتکب ہوکر گمراہ ہوگئے اور اللہ کی شریعت کو بھول گئے۔ اسی طرح امت مسلمہ میں گمراہ فرقوں کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں ہیں۔ جنہوں نے صفات الٰہیہ کا انکار کیا اور تحریف وتاویل کا بازار گرم کیا، انہوں نے شریعت اسلامیہ کی بیشتر چیزوں کا انکار کردیا اور الحادی طریقے اختیار کرکے غیر اسلامی چیزوں کو رواج دیا۔ یہ خاص یہود کا طریقہ ہے۔ آج معیشت، سیاست، قانون، معاشرت اور اخلاق واعمال سے اسلام کا نکل جانا اسی کا شاخسانہ ہے۔ اسی طرح دوسرے طبقے کے لوگوں نے انبیاء اور اولیاء کو اللہ کی صفات سے متصف قرار دے کر شرکیہ عقائد کو عام کیا۔ بہت سے لوگوں میں عقائد پھیلے ہیں کہ نبی اور اللہ میں کوئی فرق نہیں۔ اولیاء بھی اللہ کا پرتو ہیں۔ نبی غیب

جانتے ہیں، حاضر وناظر ہیں، مختار کل ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دین میں غلو ہے۔ اس سے آج بھی شرک اسی طرح پھیلا ہے، جس طرح پہلی امتوں میں پھیلا۔

ایک ضروری وضاحت:

قرآن حکیم کی آیات واحادیث کے ساتھ جب یہ عقیدہ بیان کیاجاتا ہے کہ اللہ عرش پر ہے، تو کچھ لوگ بعض قرآنی آیات کو پیش کرکے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ ہرجگہ موجود ہے۔ مثلاً سورۃ المجادلہ میں ہے﴿ هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَاكَانُوْا ﴾ وہ (اللہ) ان کے ساتھ ہے جہاں کہیں وہ ہوں ،، اسی طرح سورۃ ق میں ہے﴿ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○﴾ یعنی ہم گردن کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں ۔''

اسی طرح بعض دوسری آیات سے یہ مفہوم نکالا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ عقیدہ و ایمان کی تمام چیزوں کو اگر اپنے قیاس سے بالا قرار دے کر سمجھیں گے تو دقت پیش نہیں آئے گی۔ ورنہ الجھنیں پیدا ہوتی جائیں گی، جبکہ عقیدہ میں شک اورالجھن سے بچنا ضروری ہے۔ منطقی اور عقلی دلائل سے بات کرنے والوں نے کہا کہ جب اللہ ہر کسی کے ساتھ ہے، تواس کا مطلب یہ ہے، کہ اللہ ہرجگہ موجود ہے، اگر عرش پر تسلیم کریں گے تو اللہ کو محدود ماننا پڑے گا یا کسی خاص سمت میں قرار دینا پڑے گا۔ تو انہوں نے وجود کی بحثوں میں غلو کرتے ہوئے، وحدت الوجود کا نکتہ نکالا، بعض نے اس سے حلول کا تصور نکالا، یعنی اللہ ہرچیز میں ہے (معاذ اللہ) ایسی بہت سی بحثیں عقلیت پسندوں نے شروع کیں۔ ان سب لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کو اپنی عقل کے دائرے میں لا کر بیان کرتے اور سمجھتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہنا کہ اگراللہ عرش پر ہے تو ہر کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ مان

لیا جائے کہ پچھلی رات کو اللہ آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ عرش پر نہیں ہوتا.....ہم سمجھتے ہیں کہ عقلیت پسندوں نے بہت بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ اللہ کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے جبکہ اللہ پر یہ قاعدے فٹ نہیں کئے جاسکتے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ عرش پر ہے اور آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے۔ ہم دونوں باتوں کو مانتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم یہ معنی نکالیں کہ اللہ ہرجگہ بھی موجود ہے یا ہرچیز میں موجود ہے۔جتنی بات قرآن میں اورحدیث میں بیان ہوگئی ہے، ہم اس کو اسی طرح تسلیم کرتے ہیں، خود اپنا مفہوم یامراد نہیں نکالتے۔

بعض نے کہا کہ اللہ ذات کے لحاظ سے عرش پر ہے، لیکن علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر جگہ ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس تکلف میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا کہ اللہ عرش پر ہے۔ ہم مانتے ہیں۔حدیث میں ہے کہ اللہ پچھلی رات آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے تو ہم ایمان رکھتے ہیں، کہ اللہ نزول کرتا ہے۔ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ جب نزول کرتا ہے تو عرش پر ہوتا ہے کہ نہیں ۔کیونکہ ہم تشبیہ بیان نہیں کرتے اور نہ ہی قیاس کرتے ہیں ۔نہ کیفیت بیان ہوئی ہے اور نہ قرآن و حدیث نے یہ بحث کی ہے کہ نزول سے عرش پر ہونے کی نفی ہوتی ہے۔اس لئے ہم بحث نہیں کرتے۔ جس طرح جو بیان ہوا، اسے تسلیم کرتے ہیں ۔ اسی طرح ''وَهُوَمَعَهُمْ'' اللہ ان کی معیت میں ہے یعنی ان کے ساتھ ہے،،سے یہ بحث نہیں کی گئی کہ معیت کیسی ہے۔ جب اس کی کیفیت بیان ہی نہیں ہوئی تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کا ہرجگہ موجود ہونا ہے۔ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اورشہ رگ کے قریب ہے ۔قریب کس طرح ہے ۔قریب کواپنے قیاس سے

نہیں مانتے۔قربت اور بعد کے انسانی پیمانوں کو اللہ پر فٹ کرنا درست نہیں سمجھتے ۔ اس لئے یہ تکلف بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ ہم اللہ کی معیت کے لئے علم یا قدرت کی شرط لگالیں۔ یعنی جس طرح بیان ہوگیا ،اسی پر ایمان لانا چاہئے۔ مذکورہ آیات کی وجہ سے قرآن و حدیث میں وجود کی فلا سفہ والی بحثیں نہیں ملتیں۔ کہیں نہیں کہا گیا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہ بحثیں عقل اور منطق کے زور پر باتیں کرنے والوں نے نکالی ہیں۔ اس لئے وہ غلطی کرتے ہیں۔جبکہ دوسری طرف ہمارے بہت سے علماء منطقی وجودی بحثوں سے بچنے کے لئے کہتے ہیں کہ اللہ بذاتہ عرش پر ہے اور علم کے ساتھ ہرجگہ موجود ہے تو اس سے منطقی لوگوں کا رد تو ہوا ہے لیکن اس سے بھی بحثوں کے دروازے کھلتے ہیں ۔دوسری بات یہ ہے کہ یہ تقسیم قرآن و حدیث میں اس طرح سے نہیں کی گئی تو ہمیں بھی بچنا چاہئے۔ یہ کہنا کہ بذاتہ عرش پر ہے اور بعلمہ ہر جگہ ہے، یہ صریح حکم ہے۔ ہمیں حکم لگانے سے بچنا چاہئے جبکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم نہیں لگایا۔ تقاضائے ایمان یہ ہے کہ بس ہم تسلیم کریں، جس طرح قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے ۔ اضافہ اور کمی سے بچیں۔

عقیدۂ سلف کے فوائد اور انحراف کے مضمرات:

تاریخ شاہد ہے کہ عقائد میں الحاد اور غلو اختیار کرنے والوں نے امت میں تباہی پھیلائی۔ آج بھی وہی طبقے تباہی پھیلا رہے ہیں۔ ان چیزوں کو بظاہر بہت چھوٹا سمجھا جاتا ہے، حالانکہ عقائد کی یہی خرابیاں ہیں، جن سے امت مسلمہ ٹکڑوں اور فرقوں میں بٹ گئی اور خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ قوت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ مسلمان جہاد اور اقامت شرع اللہ سے محروم ہوگئے۔ امت کو اکٹھا کرنے والی چیزیں صرف سچا

ایمان ہے، جس کا علم وحی الٰہی، یعنی کتاب وسنت سے حاصل ہوتا ہے اور اس پر عمل سے ہی ایمان میں رسوخ پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ایک امت اور ایک قوت بنتے ہیں۔ عقائد کی گمراہیاں شیطان کی خاص چالیں ہیں۔ ان سے بچ کر ایمان کی رسائی اور پختگی کی طرف آنا ضروری ہے۔ خاص طور پر اللہ کے اسماء وصفات کے بارے میں پیدا ہونے والی غلطیوں سے بچنا چاہئے کیونکہ اس سلسلے میں جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، عام طور پر ان پر غور نہیں کیا جاتا۔ جب آدمی اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ مجھے ہر حالت میں دیکھتا ہے، وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے تو وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ عبادت میں دل لگاتا ہے۔ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ بھی محبت کرتا ہے۔ وہ ہر وقت ہماری مدد کرتا ہے۔ انسان کا اللہ پر توکل بڑھتا ہے۔ وہ اس کیلئے صبر کرتا ہے۔ ہر آن شکر بجالاتا ہے۔ وہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ کی ذات ہر چیز سے بلند عرش پر ہے، اس لئے اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ یہ بھی ایمان رکھتا ہے کہ پچھلی رات اللہ آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے تو بندہ رات کو بیدار ہوتا ہے اور اللہ سے خصوصی مناجات کرتا ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو شخص اللہ کی صفات کا انکار کرے، وہ کبھی ایمان، تقرب الی اللہ اور اللہ کی محبت کی لذت سے آشنا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایمان بنانے کی باتیں کرے گا تو صرف ایک تکلف ہوگا۔ اللہ نے قرآن میں اس لئے کہا ہے کہ علماء عام لوگوں کی نسبت اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ علماء صحیح علم کی وجہ سے عقیدہ توحید میں زیادہ پختہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی خشیت اور تقرب الی اللہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور جو علماء عقیدہ پر بحث کرکے آج بھی معتزلہ اور جہمیہ والے عقیدے بیان کرتے ہیں تو وہ خشیت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہی امت کو پھاڑ رکھا ہے۔ سب سے زیادہ لالچی انہی

لوگوں کو دیکھا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات پر صحیح علم اور ایمان رکھا جائے۔ کسی نبی، ولی، زندہ مردہ کو اللہ کی صفات سے متصف قرار نہ دیا جائے۔ کبھی یہ نہ کہا جائے کہ علم، قدرت، تخلیق، تدبیر میں کوئی اللہ کا شریک ہے۔ سب اللہ کے بندے ہیں، اللہ نے جس کو جس طرح پیدا کیا، جتنا علم دیا، جتنی قوت دی اور جتنا مال دیا، یہ سب اللہ کی عطا ہے۔ نبی ولی سب اللہ کے بندے اور غلام ہیں۔ سب اس کے فقیر اور محتاج ہیں۔ سب مخلوق ہیں، وہ اکیلا داتا ہے۔ "اَلْحَیُّ" اور "اَلْقَیُّوْمُ" ہے۔ عَالِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ اس کی ذات اور صفات میں کوئی ذرہ برابر شریک نہیں ہے۔

ہم اللہ کے تمام اسماء اور تمام صفات پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان کیا۔ کسی صفت کا انکار نہیں کرتے۔ کسی کو اللہ کی مثل بیان نہیں کرتے اور اللہ کی صفات سے وہی معنی مراد لیتے ہیں جو کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ اللہ کے عرش پر ہونے اور نزول کو مانتے ہیں جس طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ اللہ کا عرش پر ہونا ہمیں معلوم ہے (کیونکہ اللہ نے بیان کردیا) اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں (کیونکہ اللہ نے بیان نہیں کی) اس عقیدہ پر ایمان واجب ہے اور اس پر بحث بدعت ہے (کیونکہ شریعت میں اس پر بحث نہیں کی گئی) حقیقت میں اسماء وصفات پر صحیح عقیدہ رکھنے کیلئے یہ راہنما قاعدہ ہے۔ جو چیز کتاب وسنت میں بیان ہو چکی ہے، اسی پر ایمان ہونا چاہئے۔ اس کو اسی طرح مان لینا چاہئے۔ جو لوگ ایمان لانے کی بجائے عقلی علوم کے ساتھ بحث کرتے ہیں، وہ شکوک کو جنم دیتے ہیں۔ اسی سے ایمان متزلزل ہوجاتا ہے۔ جب ایمان متزلزل ہوجاتا ہے تو عمل نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ دین اور عقائد کا علم کوئی فلسفہ نہیں ہے کہ اس پر الگ الگ

رائے رکھی جائے اور بحث کی جائے۔ یہ تو ایمان کی باتیں ہیں۔ جس طرح بیان کیا گیا، انہیں اسی طرح مان لیا جائے۔ اسی میں انسان کا اطمینان ہے۔ صحابہؓ اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں صحیح ایمان تھا۔ بحثیں نہیں تھیں۔ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے بیان کردیا، صحابہ نے اسی طرح مان لیا۔ بحثیں نہیں کیں۔ انکار نہیں تھا، بدعملی اور فرقے نہیں تھے۔

آیئے! ہم اسی طرح ایمان لائیں، عقائد میں پختگی اختیار کریں اور امت مسلمہ کو عقائد کی گمراہیوں اور بحثوں سے ہٹا کر کتاب وسنت پر جمع کرکے دعوت وجہاد کا فریضہ انجام دیں تاکہ اللہ ہم سے راضی ہوجائے اور ہم سرخرو ہوجائیں۔

توحیدالحکم (حاکمیت میں توحید)

عام طور پرعلماء نے حاکمیت میں توحید کے مسئلہ کو توحید الوہیت یعنی توحیدِ عبادت کا حصہ قرار دیا ہے اوراسے الگ طور پر بیان نہیں کیا۔لیکن بہت سے علماء وہ بھی ہیں، جو حکم (حاکمیت) کے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ طور پر بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم کا مسئلہ عبادت کا اہم ترین جز ہے۔انسان کی فطرت ہے کہ جس کو حکم کا حق دے گا، اس کے سامنے ہی جھکے گا اور اطاعت کرے گا۔ اسلام میں حکم کا حق صرف رب العالمین کا ہے۔ اللہ کے سوا کسی فرد ،جماعت،طبقہ یا مجموعی طور پر پوری امت کو بھی حکم کا حق حاصل نہیں ہے۔ اصولی طور پر اللہ کے سوا جس کو بھی حکم کا حق دیا جائے گا ، اسے اللہ کا شریک بنایا جائے گا۔تمام انسان اللہ کے بندے ہیں۔ سب اسی کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔ اللہ کا حق ہے کہ وہ بندوں کو حکم دے اور بندوں کا فرض ہے کہ سب اس کی اطاعت کریں۔ اسی سے ہر قسم کا عدل قائم ہوتا ہے اورظلم کے دروازے بند ہوتے ہیں۔

حکم دو قسم کا ہے! حکم تکوینی اور حکم تشریعی ،حکم تکوینی .....یعنی حکم قدری یہ ہے کہ جس میں انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ۔مثلاً بیماری آجانا، پیدائش وغیرہ۔ انسان چاہے یا نہ چاہے بہت سے امور اس کے اختیار یا ارادے کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔مسلمان کا اس پر ایمان ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے نفع ونقصان، صحت وبیماری اور موت وحیات ، اس میں بندے کے اختیار کا دخل نہیں ہوتا۔

حکم تشریعی.....وہ ہے جس کی اطاعت کے لئے اللہ نے شریعتیں نازل کی ہیں۔ انبیاء ورسل اور کتب کے ذریعے حلال و حرام اوراوامر و نواہی اور معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے ہدایات ،آداب ، اَخلاق مقرر کئے ہیں اور عبادات ومعاملات متعیّن فرمائے ہیں۔مسلمانوں کو پابندکیاجاتاہے کہ وہ احکام الٰہی کو اپنی زندگیوں اور معاشروں میں قائم کریں ۔ان پرعمل کریں۔ ان کی دعوت دیں اور ان کے غلبہ کے لئے جہادکریں۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شریعت کے احکام بنانے کا اختیار انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا۔صرف انہیں نافذ کرنے کااختیار ہوتاہے۔ اسی اختیار میں بندوں کا امتحان ہے کہ وہ انسانی ضابطوں،قوانین اور ڈھانچوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کو نافذ کرتے ہیں یا اللہ کاحکم قائم کرکے اپنے آپ کو اللہ کا تابع بنالیتے ہیں۔

جہاں تک تکوینی یا قدری حکم کا تعلق ہے، وہ خود بخود نافذ ہوتا ہے ۔ اس میں بندوں کا امتحان نہیں ہے، کیونکہ بندوں کا اس میں اختیارنہیں ہے۔ یہ سوال نہیں ہوگا، کہ تم پیدا کیوں ہوئے تھے یا مرے کیوں تھے یا فلاں وقت تمہیں گھاٹا کیوں پڑ گیا تھا۔ان امور کومسلم اور غیرمسلم سب ہی اللہ کی طرف سے جانتے ہیں ۔پہلے مشرکین بھی مانتے تھے اور آج کے مشرکین بھی اختلاف نہیں کرتے۔ اصل مسئلہ حکم تشریعی کا ہے ۔انبیاء اور کتب کا بڑا موضوع بھی حکم تشریعی ہی ہے۔

حکم تکوینی اورحکم تشریعی کی وضاحت کے لئے سورۂ یوسف کی مثالوں پرغور کیجئے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام جب جیل میں بند کردیئے گئے تو دوشخص اور بھی ان کے ساتھ قید میں تھے۔ یوسف علیہ السلام بحیثیت نبی اپنا دعوتی فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے قید کے ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں۔

﴿ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌاَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ○ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَامِنْ سُلْطَانٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَاَلَّاتَعْبُدُوْٓااِلَّاۤاِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ○﴾ [یوسف : ۳۹۔۴۰]

''اے میرے قید کے ساتھیو! بہت سے رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو بہت قوت والا ہے۔تم تو اللہ کو چھوڑ کر کچھ ناموں کو پوجتے ہو۔ جو نام تم نے خود رکھ لئے ہیں یا تمہارے باپ دادا نے، کچھ نام ان کو دے دیئے جبکہ اللہ نے اس کی کوئی سند نازل نہیں کی۔حکم تو صرف اللہ کا ہے۔اسی کا فرمان ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

آیات مبارکہ میں یوسف علیہ السلام دعوت توحید پیش کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ حقیقت میں حکومت صرف اللہ کی ہے ،اسی کا حکم بھی چلنا چاہئے۔لیکن عجیب بات ہے کہ لوگ اللہ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے۔لوگوں نے سب سے بڑے اور سب سے اہم مسئلہ کو نہیں سمجھا۔اللہ کو چھوڑ کر بہت سے معبود بنالئے۔خود ہی ان کے نام رکھ لئے اور خود ان کو اختیارات سونپ دیئے اور ان کے بارے میں گمان کرلیا ہے کہ یہ خدا فلاں فلاں نام سے فلاں فلاں کام کرتے ہیں۔جبکہ اللہ نے اپنے اختیارات کسی کو نہیں سونپے اور نہ کسی کو ان کاموں پر مامور کیا ۔لوگ سب کچھ اپنی طرف سے کرتے ہیں۔ اللہ کا حکم چھوڑ کر اپنی پسند اختیار کرتے ہیں۔ یہ حکم تشریعی کی مثال ہے۔

حکم تکوینی کی مثال بھی سورہ یوسف میں ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ تم اکٹھے ایک ہی دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا۔ ہوسکتا ہے تمہیں

کوئی نقصان پہنچ جائے، تمہارے پیچھے کوئی لگ جائے یا تمہیں نظر لگ جائے۔ یہ خوبصورت اور جوان تھے۔ باپ نے خطرے کے پیش نظر نصیحت کی، لیکن ساتھ ہی کہا کہ اصل حکم تو اللہ کا چلتا ہے۔ اگر اس کی طرف سے کوئی نقصان ہونا ہوا تو کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں اللہ پر توکل رکھتا ہوں اور سب کو اسی پر توکل کرنا چاہئے، گویا وہ اس عقیدے کا اظہار کررہے ہیں کہ اگر اللہ کو کوئی نقصان منظور ہے تو میں اس کے ردّ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ خطرے سے بچنے کیلئے انسان تدبیر کرسکتا ہے، تدبیر اس لئے ضروری ہے کہ انسان کو علم نہیں ہوتا کہ اللہ کا فیصلہ کیا ہوگا۔ توکل کا یہ مطلب نہیں کہ دنیاوی وسائل کے استعمال کو غلط سمجھا جائے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ کا گھٹنا باندھو، پھر اسے اللہ کے سپرد کرو۔ (ترمذی)

دونوں مثالوں میں حکم کی دونوں شکلیں واضح ہوجاتی ہیں۔ پہلی مثال میں حکم تشریعی کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور کسی کو عبادت کے لائق نہیں بنایا۔ لیکن انسان خود ہی غیروں کو عبادت کے لئے مقرر کرلیتے ہیں۔ عبادت اور اطاعت کا اپنا نظام قائم کرکے اس کی اطاعت شروع کردیتے ہیں۔ اللہ نے بندوں کو حکم تسلیم کرنے کا جو اختیار دیا ہے۔ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دوسری مثال میں حکم تکوینی کی وضاحت ہے، جس میں یعقوب علیہ السلام نصیحت کے ساتھ اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کے ہٹانے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں۔ صرف اللہ ہی کا حکم چلتا ہے۔

زیادہ وضاحت طلب معاملہ حکم تشریعی کا ہے جو حاکمیت کی اصل بحث ہے۔

حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ یعنی فرمانروائی کا حق کسے دیا جاتا ہے۔ یعنی مقتدر اعلیٰ (Sovereign) کون ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ ادیان و نظریات میں زیر بحث

رہا۔ اللہ کی نازل کردہ شریعتوں اور انبیا و رسل نے ہمیشہ یہ وضاحت کی کہ حاکمیت یعنی فرمانروائی کا حق صرف رب العالمین کا ہے۔ اس نے ساری کائنات پیدا کی ہے۔ تمام مخلوق اسی کے حکم پر قائم ہے اور اسی کی فرمانبردار ہے۔اسی لئے زمین و آسمان اور سورج چاند ستاروں وغیرہ ہر چیز کا نظام صحیح چل رہا ہے۔اسی اللہ کا حکم انسانوں پر بھی چلنا چاہئے۔اگر کائنات میں دو رب مان لئے جائیں تو کبھی نظام نہیں چل سکتا۔ فطرت بھی یہی تقاضا کرتی ہے ۔اللہ کی شریعت دنیا میں جاری فطرت کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے۔اس لئے کہ جس نے فطرت بنائی ، اسی نے شریعت بنائی۔ اگر دونوں کا خالق الگ الگ مان لیا جائے تو بگاڑ کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اسی کا بگاڑ دنیا میں ہمیشہ دیکھا گیا۔ یہی ظلم عظیم ہے کہ اللہ کا حق دوسروں کو دے دیا گیا۔ اس ظلم سے ہی دنیا میں ہر قسم کا ظلم پھیلتا ہے۔اس بڑے ظلم کے خاتمے کے لئے اللہ کے نبی، رسول اور کتابیں اور شریعتیں آئیں۔ اللہ کے نبی اور شریعتیں انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتی رہیں اور ظلم کا خاتمہ کرکے اصلاح کرتی رہیں ۔کسی نبی نے صرف دعوت کے ساتھ لوگوں کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اللہ کا حکم پہنچایا اور کچھ نبی ایسے بھی تھے جنہیں دعوت کے ساتھ جہاد کی ذمہ داری بھی دی گئی کہ قوت تیار کرکے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوجاؤ اور دنیا سے ظلم مٹا کر اللہ کا حکم قائم کردو۔ آخری نبی محمد ﷺ کو دعوت کے ساتھ جہاد کی فرضیت بھی سونپی گئی اور انہیں مامور کیا گیا کہ تمام ادیان پر اسلام کو غالب کردو۔ چنانچہ نبی ﷺ نے خود دعوت کے ساتھ جہاد کیا اور اپنی امت کو اس کا پابند بنایا اور قیامت تک جہاد و قتال کو جاری رکھنے کا حکم دیا اور اس کا بنیادی مقصد یہ قرار دیا کہ اللہ کا حکم بلند ہو اور غیر اللہ کے کلمے سرنگوں ہوجائیں۔

اللہ سے بغاوت کا نیا انداز فرد واحد اور اکثریت کی آمریت:

قدیم دور میں زیادہ تر انحصار اس بات پر رہا ہے کہ بعض انسان اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھ لیتے یا لوگ ان کی کہی ہوئی بلکہ خواہش کی ہوئی ہر بات کو حکم کا درجہ دیتے اور ان کے سامنے جھک جاتے۔ ایسے بہت سے فرعون انسانی تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اللہ کی ربوبیت، الوھیت اور حاکمیت کا اعلان کرنے والے اور فرعونوں سے اس مسئلے پر لڑنے والے اللہ کے بندے بھی ملتے ہیں۔ لیکن آخری امت میں حاکمیت کا رنگ ذرا بدلا۔ عام طور پر کسی نے اپنے کو رب بنا کر تو اپنا حکم منوانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ غیر اسلامی مذاہب و نظریات سے فائدہ اٹھا کر اور انہیں اسلام میں داخل کر کے حاکمیت کا رنگ بدل دیا۔ بعض نے اپنے آپ کو ظل الٰہی کے طور پر پیش کیا اور لوگوں نے بھی ان کو یہ حق دیا کہ ان کی ہر خواہش اللہ کا حکم ہے۔ اس سے ظالم بادشاہ من مانی کرتے رہے۔ مسلم معاشروں میں ظلم پھیلتا رہا۔ پھر جدید دور میں چونکہ مغرب کو سیاسی اور معاشرتی تسلط حاصل تھا، اس لئے ان کا نظریۂ جمہوریت پھیلا اور مسلمان ملک اور معاشرے ان سے متاثر ہوئے۔ خصوصاً اس لئے کہ بیشتر مسلمان علاقے بڑی دیر تک مغربی ملکوں برطانیہ وغیرہ کے زیر حکومت رہے۔ اسی ذریعے سے یہ نظریہ پھیلا کہ حاکمیت یعنی اقتدار اعلیٰ کا حق ریاست کے تمام افراد کو مجموعی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ ان کی نمائندگی چونکہ پارلیمنٹ کرتی ہے، جس کا انتخاب عوام کرتے ہیں، تو حاکمیت کا حق عوامی نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کو حق ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے فائدے کے لئے وہ جو چاہیں دستور اور قانون وضع کریں۔ ان کی اکثریت سے حکومت بنتی ہے، جو دستور و قانون کو نافذ کرتی ہے۔ یہ پورا نظام عوام کی حاکمیت پر

قائم ہوتا ہے۔ یہی نظام تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اکثر ملکوں میں نافذ ہے اور عالمی سطح پر اسے تسلیم کیا گیا ہے ۔صرف اسلام نے اسے قبول نہیں کیا۔باقی سب مذاہب اور قوموں نے بعض تبدیلیوں کے ساتھ مانا ہوا ہے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قبول کیا ہوا ہے۔ وہ عالمی حالات کے مطابق چلنا چاہتے ہیں لیکن عالم کے رب اور اس کے دین کی پرواہ نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حاکمیت یعنی اقتدار اعلیٰ کا حق اللہ کے سوا کسی کو سونپنا صریحاً کفر اور شرک ہے۔ وہ بادشاہ ظالم تھے جن کا حق حاکمیت تسلیم کرکے ان کی غلامی کی گئی۔اسی طرح بعض طبقوں اور جماعتوں کو اقتدار اعلیٰ کا حق دے کر دنیا میں آمریت کے نظام قائم کئے گئے جیسا کہ بہت سے کمیونسٹ ملکوں میں آمریت چلتی رہی ہے۔ آمریت بھی اسی طرح کا ظلم ہے اور ریاست کے عوام کو حق حاکمیت دینا اور ان کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کو ریاست میں قائم کرنا اور اس کے لئے دستور و قانون وضع کرنا بھی صریح ظلم ہے۔ کوئی فرد یا جماعت یا سب عوام اقتدار اعلیٰ کا حق نہیں رکھتے۔ ان اصولوں پر بنے ہوئے سب نظام اللہ کے خلاف کھلی بغاوت ہیں۔ ان کا اپنا کوئی حقِ حاکمیت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اللہ کے حقِ حاکمیت میں شریک ہیں۔ سب اللہ کے بندے ہیں۔ کچھ اللہ کی بندگی کو مانتے ہیں، جو مسلمان کہلاتے ہیں اور کچھ اللہ کی بندگی سے انکاری ہیں وہ مسلمان نہیں ہیں۔مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا حکم قائم کریں۔

موجودہ دور میں پارلیمنٹ کے حق حاکمیت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔بہت سے جدید علماء بھی جدید فکر سے متاثر ہوکر ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اللہ کے قرآن کی رہنمائی ضروری ہے۔قرآن نے یہودیت اور عیسائیت کو ہدف تنقید

بناتے ہوئے بتایا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے پیشواؤں کو رب مان کر ان کی اطاعت شروع کی ہوئی تھی۔سورہ التوبہ میں ہے۔

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبہ : ۳۱]

''انہوں نے اپنے علما و مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنالیا تھا۔''

آیتِ قرآنی میں احبار او ررھبان کے الفاظ ہیں۔ احبار یہود کے بڑوں کو کہا جاتا تھا اور رہبان راہب کی جمع ۔اس سے مراد نصرانیوں کے پیشوا ہیں۔انہیں رب کیوں کہا گیا۔اس کی وضاحت عدی بن حاتم والی روایت سے ہوتی ہے۔ جسے ابن کثیر اور دیگر معتبر تفاسیر نے بیان کیا ہے۔

عدی بن حاتم جو پہلے نصرانی تھے، نے قرآن کے اس بیان کے بارے میں نبی ﷺ سے وضاحت پوچھی ۔کہنے لگے کہ اسلام سے پہلے ہم نے کبھی احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا تھا۔ پھر قرآن نے ایسا کیوں کہا۔ اس پر نبی ﷺ نے عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا یہود و نصاریٰ ان پیشواؤں کو حق نہیں دیتے کہ وہ جو حکم دیں ، اسے مان لیا جائے۔ حلال وحرام کے بارے میں بھی حکم جاری کرنے کا انہیں اختیار کیا نہیں دے رکھا اور کیا ان کے حکم پر عمل نہیں کرتے ۔تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی کہ بالکل ایسا ہی ہے۔ انہیں حکم کا اختیار حاصل ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا، یہی ان کو رب بنانا ہے۔قرآن نے اسی معنیٰ میں ان کی ربوبیت کی بات کی ہے۔ (ترمذی، مسند احمد)

قرآن نے وضاحت کی ہے کہ اللہ ہی الہ واحد ہے۔ اسی کی عبادت ہے ۔اللہ کے علاوہ کسی کو حاکمیت کا حق دینا اسے رب اور الہٰ ماننا ہے۔آج مسلم ملکوں میں پارلیمنٹ کو اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔حکومتیں اورعوام ان کی پابندی کرتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں اسے ہی دین بنانا کہا گیا ہے۔سیدھا صاف دین یہ ہے کہ صرف اللہ

کے حکم کی اطاعت ہو اور کسی کو حکم کے حق میں اللہ کا شریک نہ بنایا جائے۔
سورہ الشوریٰ میں فرمایا:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

''کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے، جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔ اگر فیصلے کے دن کا وعدہ نہ ہوتا تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اور جو ظالم ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

سورہ شوریٰ میں تشریع لغیر اللہ کے بارے میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ جو لوگ اپنے طور پر بندوں کے لئے تحکیمِ شریعت کے اختیارات رکھتے ہیں، وہ اللہ کے شریک ہیں۔ دوسرے ایسے عقیدے رکھنے والے لوگوں کے بارے میں سخت وعید بیان فرمائی ہے۔

صحیح عقیدہ اور منہج یہ ہے کہ دین حکم اللہ کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ حق نہ کسی فرد کو دیا جاسکتا ہے اور نہ مجموعی طور پر جماعت یا امت کو یہ حق حاصل ہے۔

اسلامی جمہوریت کا دھوکا:

بڑا مغالطہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ارکان کی پارلیمنٹ بحیثیت مجموعی حاکمیت کا حق رکھتی ہے، کیونکہ عام لوگوں نے ان کو اعتماد دیا ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ مسلمان ہوتے ہیں اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ وہ تو اللہ کے حق کو بخوبی سمجھتے ہیں تو وہ اللہ کے شریک کیسے بن سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دیا ہی نہیں۔ چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ لیکن پارلیمنٹ کو آج یہ اختیارات حاصل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عملاً مسلمان ملکوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کھلی اللہ

کی بغاوت ہے۔ پارلیمنٹ میں جو چیز منظور ہوجاتی ہے وہ نافذ ہوجاتی ہے۔ آج اگر کوئی مسلمان جج قرآن کے واضح حکم پر فیصلہ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ وکلاء اسے فوراً ملکی قانون کا حوالہ دیں گے جسے پارلیمنٹ کا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ وہاں مسلمان جج مجبور ہوجائے گا۔ اسے قرآن کا حکم چھوڑ کر پارلیمنٹ کا منظور شدہ قانون ماننا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص پاکستان میں کہے کہ میں بنک کے قرض پر سود ادا نہیں کروں گا کیونکہ یہ شریعت کے صریحاً خلاف ہے تو حکومت حرکت میں آئے گی اور اس کی جائداد ضبط کرلی جائے گی۔ اللہ کا حکم نہیں سنا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل نظاموں کی تاویلیں کرنے کی بجائے ان کی ایسی حقیقی اور عملی شکل کو دیکھا جائے کہ کس طرح اللہ کے حکم کو رد کیا جاتا ہے اور اپنے حکم چلائے جاتے ہیں۔

اللہ کی حاکمیت اور نبی ﷺ اور امیر کی اطاعت کی حیثیت:

اللہ کے حق حاکمیت کی وضاحت کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نبی اور حکومت کی کیا حیثیت ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے پہلے اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ مصدر حاکمیت بلاشرکت غیرے اللہ رب العالمین ہے۔ لیکن نبی کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے مامور ہیں۔ وہ خود بخود نہیں بلکہ اللہ نے انہیں مطاع بنایا ہے، یعنی ان کی اطاعت کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ والدین اور حکومت کی اطاعت بھی اللہ کے حکم سے ہے۔ مخلوق میں سے کسی کا حکم اللہ سے ٹکرا جائے تو اس کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبی کی بات اور اللہ کے حکم میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ غلط عقیدے یا بدنیتی کی وجہ سے اللہ اور رسولؐ کے درمیان اختلاف ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اختلاف بیان کرتے ہیں۔

دراصل وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور قرآن کی تشریحات اپنی مرضی سے کر کے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نبی ﷺ کو اللہ نے اطاعت کے اعتبار سے مقام دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾ [الحشر : ۷]

''جو چیز تمہیں نبی ﷺ دیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں، اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت پکڑنے والا ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء : ۸۰]

''جو رسول کی اطاعت کرے گا بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

لیکن نبی ﷺ کے بعد امراء یا آئمہ حکومت کی اطاعت کو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ گویا کہ کوئی حاکم اپنی اطاعت کا حکم نہیں دے سکتا بلکہ وہ خود بھی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اور ماتحتوں کو بھی اللہ اور رسول ﷺ کا تابعدار بنائے گا۔ یہی اسلامی حکومت ہے۔ اگر حاکم خود غلطی کر لے تو دوسروں کو غلطی کا پابند نہیں بنائے گا بلکہ انہیں اللہ کی شریعت پر چلائے گا۔ حاکم کی غلطی امت کے لئے دلیل نہیں ہے۔ حاکم سے غلطی پر رعایا باز پرس کر سکتی ہے۔ اسے تنبیہہ کر سکتی ہے اور افراد امت کا فرض ہے کہ وہ حاکم کو نصیحت کریں۔ اسلام میں حاکم آمر مطلق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ مشورہ کر کے فیصلہ کر لے۔ مشورہ لینے والوں اور مشورہ دینے والوں سب پر لازم ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے حکم تک پہنچنے کی کوشش کریں اور سب کے پیش نظر امت کی فلاح ہونی چاہئے۔ کوئی ذاتی مقاصد نہیں ہونے چاہئیں۔ اس اعتبار سے اسلام میں حکم اور اس کے نفاذ کا اپنا ایک

نظام ہے۔وہ دوسرے تمام نظاموں سے قطعی مختلف ہے۔ اسے بادشاہت ،آمریت یا جمہوریت میں سے کسی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام اور جمہوریت متضاد ہیں:

پہلوں نے اگر اسلام کے نام پر بادشاہتیں قائم کیں اور کرسیوں پر لڑائیاں کیں اور اپنی آمریتیں چلائیں تو جدیدیت کے حامیوں نے بڑی کوشش کے ساتھ اسلام کے نظام حکم کو جمہوریت سے ہم آہنگ کیا ہے بلکہ حقیقت ہے کہ مغربی طرز جمہوریت کی اصلاحات کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کی روح پروان چڑھی ہے۔مسلم معاشرے اور ملک الحاد کی طرف بڑھے ہیں، وضعی دستوراور قانون کی اطاعتیں ہوئی ہیں۔ اللہ کا حکم بھی قائم نہیں ہوسکا۔مسلم ملکوں میں اسلام پسند طبقے جمہوری حکومتوں سے مطالبے ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ اسلام کی حکمرانی قائم کی جائے، اس کے لئے فلاں دستوری ترمیم ضروری ہے۔ بڑے شور ڈالنے سے اسلام کی بعض شقوں کو اگر شامل کرلیا جاتا ہے تو یہ وہ شقیں ہوتی ہیں جو وضعی دستور اور قوانین کے بنیادی ڈھانچے کو نہیں بدلتیں۔ ان سے معاشی اور سیاسی تبدیلیاں رونما نہیں ہوسکتیں .....صرف دکھاوا ہوتا ہے۔کہیں بھی اس طریقے سے اللہ کی حاکمیت اور اطاعت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اگر کہیں اسلام پسند جماعتوں کی محنت سے دستور میں اللہ کو حاکم مطلق کہا گیا تو اسے دساتیر کے عملی طریق کار کے قوانین میں لاکر بے اثر کر دیا گیا۔ ان دستوروں کی موجودگی میں کبھی عدالتیں اللہ کی شریعت پر فیصلہ نہیں کرسکیں۔ ملکوں میں عوامی حاکمیت کا ایک نظام ہے، جسے جمہوریت کہتے ہیں اور سیاسی طبقے ہمیشہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض مسلم ممالک میں اسی کا نام اسلامی جمہوریت رکھ دیا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جمہوریت متضاد ہیں۔

اسلام اللہ کی حاکمیت پر قائم ہوتا ہے اور جمہوریت عوام کی حاکمیت پر قائم ہوتی ہے۔مسلم ممالک میں جہاں بھی جمہوریت آئی ، اس نے اپنے گُل کھلائے۔اس نے ہر جگہ مسلمانوں میں بگاڑ اور الحاد پیدا کئے۔ اس کی بنیاد ہی عوامی حاکمیت پر ہے۔مسلمان نمائندے جہاں بھی منتخب ہوکر گئے ،انہوں نے ہرجگہ اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں غیراللہ کے نظام قائم کئے۔مصر میں ایسا ہی ہوا اور پاکستان میں عرصہ دراز سے یہی کچھ ہورہا ہے۔مقنّنہ اور عدلیہ میں مسلمان ہی یہ سب کچھ کرتے رہے ہیں۔

موجودہ جمہوری نظام میں مجلس قانون ساز کو اس بنیاد پر منتخب کرنا کہ انہیں اختیار سونپا جائے کہ وہ بندوں کے حقوق کے ضمن میں قوانین وضع کریں، پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین سے بندوں کے حقوق کا فیصلہ کریں۔یہی اصولی طور پر غلط ہے۔اللہ نے بندوں کے حقوق مقرر کردیئے ہیں ۔اللہ کی نازل کردہ شریعت میں حقوق کا بیان اور ضابطے موجود ہیں۔ ان پر مزید قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو اللہ کے قانون پہ قانون بناتا ہے ،وہ اللہ کا شریک بنتا ہے۔کسی فرد یا ادارے کو اس کا حق حاصل نہیں۔

حکومت کا قانون بنانے اوراجتہاد کا دائرہ:

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا حکومت قانون بنا ہی نہیں سکتی یا بعض امور میں قانون بناسکتی ہے اور اس کا دائرہ کیا ہوگا؟ اس کی وضاحت کے لئے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ شریعت میں دو قسم کے امور ہیں۔ کچھ امور وہ ہیں، جنہیں اللہ نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کردیا ہے ۔وہ قرآن میں ہوں یا ان کی وضاحت احادیث رسول ﷺ میں ہو۔ نماز،روزہ اور دیگر ارکان عبادات کی ذیل میں آتے ہیں اور معاملات میں نکاح

،طلاق ،وراثت کی تقسیم وغیرہ ہے۔ اسی طرح حدود جو جرائم پر لاگوہوتی ہیں(فوجداری قوانین وغیرہ)وہ چیزیں ہیں، جوشریعت میں مقرر کردی گئی ہیں، ان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ ان پر اجتہاد کرنا یا حالات کی مطابقت سے ان میں ترمیم کرنا کسی شکل میں بھی ممکن نہیں ہے۔ان کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا اور ان پرعمل کرنا فرض ہے۔ کچھ چیزیں ہرفرد کوذاتی طور پر پابند کرتی ہیں۔ کچھ چیزیں اجتماعی ہیں۔ وہ حکومت کے دائرے میں آتی ہیں۔ ان کا قائم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔لیکن کوئی حکومت یا پارلیمنٹ ان کے بارے میں قانون سازی نہیں کرسکتی۔ سب اللہ کے حکم کی پابندی کریں گے ۔اگرکوئی حاکم یا پارلیمنٹ اللہ کے حکم پر قانون سازی کریں اور اللہ کے حکم پر فیصلے نہ کریں تو وہ اللہ کی بغاوت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کفر،ظلم اورفسق قراردیاہے اور ایسے لوگوں کوکافر،ظالم اور فاسق کہاہے۔

دوسرے امور تدبیری ہیں۔ ان کا حالات سے گہرا تعلق ہوتاہے۔ مثلاً جنگ کے حالات وغیرہ۔ان امور میں حکومت مشورہ کرتی ہے اور اجتماعی مفاد میں فیصلے کرتی ہے۔ طے شدہ امور میں مشورہ اوراجتہاد وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اجتہاد تدبیری امور میں ہے۔ اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ پیش آمدہ جدید مسائل میں بھی شریعت سے مخصوص حکم معلوم کیاجائے۔ یہ علماءشریعت کا کام ہے۔بعض ملحدین نے اجتہاد سے مراد یہ لیاہے کہ جہاں قرآن و حدیث خاموش ہوں، وہاں مصالح عامہ میں اپنی دانش اور حالات کے تقاضے کے تحت فیصلے کئے جائیں۔ اس سے جدیدیت کے حامیوں نے الحاد کا دروازہ کھولا ہے۔بظاہر یہ لوگ کہتے یہ ہیں کہ ہم اجتہاد کا دروازہ کھول رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن و حدیث کوخودخاموش کرکے اجتہاد کا دروازہ بند کرتے ہیں اور الحاد کا دروازہ کھولتے ہیں۔عموماً حکومتوں نے مالی ،سیاسی اور جہاد وغیرہ

کے امور میں بالخصوص یہی کچھ کیا ہے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اللہ کی شریعت کو ہی بدل دیا۔ حتیٰ کہ حلال و حرام کا مسئلہ جو کہ شریعت میں طے شدہ ہے، ان طے شدہ مسائل کو بھی اجتہاد کے لیے تختۂ مشق بنایا گیا۔ عموماً ایسی ہی قانون سازیاں پارلیمنٹ میں ہوتی رہی ہیں۔ پاکستان میں عائلی قوانین اور مالیاتی قوانین اس کی بڑی بڑی مثالیں ہیں۔ سود اور حرام کاروبار کو تحفظ بھی پارلیمنٹ نے ہی دیا۔ جدید دور میں اس کو خدا کا درجہ دے دیا گیا ہے، جس کا اختیار سب پر ہوتا ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ پہلے زمانوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا۔ مشرکین مکہ شریکوں کو اللہ سے چھوٹا سمجھتے۔ لیکن جدید دور میں اللہ کا حکم بھی معاذاللہ پارلیمنٹوں پر نہیں چلتا۔ اللہ کے حکم کے سامنے حکام بولتے رہتے ہیں۔ لیکن پارلیمنٹ کے سامنے خاموش ہوکر آداب بجالاتے ہیں۔ ایسا بڑا شرک تو پہلے مشرکین میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں اس جدید شرک کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ۔جن کے پاس اسلام کی روشنی تھی ہی نہیں ،وہ اتنے بڑے شرک کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔ افسوس اس بات پر بھی ہے کہ آج الحاد کا سارادھندہ اسلام کی روشنی کے نام پر ہورہا ہے اور بعض علم دان بھی اس عمل میں شریک ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آج ہم توحید حاکمیت پر بھی اتنا ہی زوردیں جتنا کہ توحید کی باقی قسموں پر دیتے ہیں۔

مندرجہ بحث میں واضح کیا گیا ہے کہ حکومتوں کو کن امور میں فیصلے کرنے چاہئیں اور کن امور میں وہ صرف اطاعت اور حکم کو قائم کرنے کے پابند ہیں۔ مزید وضاحت اس بات سے بھی ہوجاتی ہے کہ قانون کی عموماً دو بڑی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی قسم بنیادی قوانین کی ہے، جن میں بندوں کے حقوق کا تعین اور ان کا دائرہ کار آتا ہے، انہیں خود نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ اللہ کی طرف سے پہلے سے طے شدہ ہیں۔ دوسری قسم میں

تحتی قوانین یا جنہیں بائی لازیارولز اینڈ ریگولیشنز کہا جاتا ہے ،وہ آتے ہیں۔ یہ تدبیری امور و قوانین ہیں جو اپنی سہولت کے مطابق شریعت کے دائرے میں رہ کر بنائے جاسکتے ہیں۔ ان دونوں کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً کاروبار میں شریعت نے حلال و حرام کی پابندی لگادی ہے ۔بعض کاروباراور نفع کمانے کے طریقے حرام قراردے دیئے گئے ہیں۔ ان کوحکومت تبدیل نہیں کرسکتی۔اللہ کے حرام کو حلال یا اللہ کے حلال کو حرام نہیں کرسکتی۔لیکن جوکاروبارحلال ہیں ،ان کے لئے شراکت کھاتے وغیرہ کے لئے کمپنی لاز بنائے جاسکتے ہیں۔ اللہ کے بنائے ہوئے دائرے کے اندر رہ کر اصول و ضوابط طے کئے جاسکتے ہیں جو قانون کی اصطلاح میں ایکٹ کہلاتے ہیں۔تاکہ کسی پر ظلم نہ ہو۔حکومت ایسے قوانین بناسکتی ہے اورنگرانی بھی حکومت کا کام ہے۔لیکن کوئی قانون اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ یہ دراصل اللہ کے حکم کو قائم کرنے کا طریقہ ہی ہوگا۔ جہاں اللہ کی نافرمانی ہوگی، وہیں حکومت حرکت میں آئے گی اور سب کو اللہ کی اطاعت پر لائے گی۔ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں ہیں، جن سے موجودہ مسلم ملکوں کی حکومتیں عہد برآ نہیں ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم ملکوں کے حکمرانوں اور پارلیمنٹوں کے رویئے، ان کے مفادات اور مصلحتیں اللہ کی حاکمیت کے قیام کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکمرانوں اور اہل سیاست کو دعوت دی جائے ۔انہیں اللہ کا حق سمجھایاجائے ۔ان میں سے اکثر لوگ وہ ہیں، جو اسلام کے بنیادی عقائد سے واقف نہیں ہیں۔ ان پر کفر کے فتوے کارگرنہیں ہوں گے۔ بلکہ دعوت کی حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔مسلم حکمرانوں میں سے کچھ لوگ اگر دین سے واقف ہیں، تو ان پر خواہشات اور مفادات کا غلبہ ہے اور اکثر کو مشکلات نے گھیر رکھا

ہے۔ اس کے لئے علماء کو بھرپور کردار ادا کر کے نہایت اہم فریضہ ادا کرنا چاہئے اور خود کو مفادات سے بالا رکھ کر اسلام کی صحیح دعوت پیش کرنی چاہئے۔

امور حکومت اور غلطی کے شکار علماء کے تین طبقے:

عالم اسلام میں عموماً تین قسم کے علماء نے امور حکومت کی طرف توجہ دی ہے.....

علماء کا ایک طبقہ وہ ہے جو اپنے مفادات کے حصول کے لئے ہر حکومت کے ساتھ ہے۔ ان کی باطل تاویلوں نے حکومتوں کو باطل پر قائم رکھنے کا سہارا دیا ہے۔ ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جو ہر طرح کے فتوے حکومتوں کو دیتے رہے ہیں۔ وہ حکومتوں کا رجحان دیکھتے ہیں ۔آج بھی ایسے علماء کی کمی نہیں ہے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں جمہوریت کو مغربی کہہ کر اس کے خلاف فتوے دیتے تھے۔ تو آج وہی جمہوریت کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ ان سے طالبان یا امریکہ کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف فتویٰ لیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہئے اور حکومتوں کو غلط مشورے نہیں دینا چاہئے اور معمولی دنیاوی لالچ میں دین کا نقصان نہیں کرنا چاہئے.....

دوسرا طبقہ علماء کا وہ ہے جو غلط فہمی کا شکار ہیں یا مجبوری کا سہارا لیتے ہیں، لیکن ویسے اپنے تئیں دین کے ساتھ مخلص ہیں ۔ان کے ذاتی مفادات نہیں ہیں بلکہ وہ دین کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔ ان کے پاس اصلاح کے بڑے بڑے پروگرام بھی ہیں۔ مصر ،شام ،پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں علماء کی ایسی تعداد ہے، جنہوں نے اصلاحِ امت کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جمہوریت کی عملی سیاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ طے شدہ نظاموں کے تحت انتخابات میں حصہ لیتے رہے اور کبھی پارلیمنٹ

میں کوئی سیٹ بھی لے لیتے ۔یہ بزرگ اصلاح کے بڑے بڑے پروگرام اپنے پاس رکھتے تھے ۔لیکن انہیں ظالم سماج نے موقع ہی نہیں دیا۔بہت سارے دل ہی دل میں پروگرام رکھ کر دنیا سے رحلت فرما گئے اور کچھ باقی ہیں، جن کی بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ ان کی مشکل یہ رہی ہے کہ وہ نظام کو غلط نہیں کہہ سکے کیونکہ وہ نظام کا حصہ رہے ۔اگر کبھی غلط کہا بھی تو ان کو صرف اس بات پر چپ کروا دیا گیا کہ چونکہ عوام نے آپ کو سیٹ سے محروم کر دیا ہے،اس لئے شکست خوردہ ہوکر آپ باتیں کر رہے ہیں۔حکومتی اور جمہوری ایوانوں میں علماء و مصلحین کے اس طبقے کے ہونے یا نہ ہونے سے سرکاری اداروں، پارلیمنٹوں اور جمہوریتوں میں اصلاح کے حوالے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ یہ بزرگ ملکوں کی سیاست میں پہچانے جاتے رہے اور ان کے بیانات اور تحریروں سے اسلام پسند طبقے کے محروم لوگوں کو حوصلہ ملتا رہا۔ وہ پارلیمنٹوں سے باہر اسلام کا کام کرتے رہے اور اس سے کچھ فائدہ بھی محسوس کیا گیا.....

تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے پارلیمانی جمہوری سیاست میں حصہ لینے کی بجائے دعوت کا راستہ اختیار کیا ۔لیکن ان کی دعوت میں تکفیر کا عنصر بہت غالب تھا۔انہوں نے حکمرانوں پر خاص طور پر کفر کے فتوے لگانے پر زور رکھا۔ دعوت کی حکمتوں کی بجائے شدت کا راستہ اختیار کیا۔ شدت جب جماعتوں میں آجائے تو بہت نقصان ہوتا ہے۔تکفیر میں شدت کی وجہ ہی تھی کہ مصر،شام ،الجزائر اور دوسرے بہت سے ملکوں میں حکومتوں سے یہ لوگ ٹکرا گئے۔ملکوں اور حکومتوں کا کم لیکن ان جماعتوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا ۔سب سے زیادہ نقصان اسلام کی دعوت کا ہوا۔ علماء کے خلاف دنیا دار طبقے کو پراپیگنڈے کا موقع مل گیا۔ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو اسلام سے متنفر کیا ۔سب سے زیادہ جہاد تختۂ مشق

بنا۔ اسی بنیاد پر جہاد کے مخالفین نے جہاد کو غلط معنوں میں پیش کیا ۔اسے دہشت گردی قرار دیا گیا۔مسلمانوں کے بارے میں یہ ذہن بنایا گیا کہ یہ لوگ اپنوں اور غیروں کے خلاف لڑنے والے ہیں ۔اس سے ظالموں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ یہ جہاد بند کرنے کی بڑی سازش ہے۔اس سے اسلام کے عمل اور ترقی کو روکنا مقصود ہے۔لیکن مسلمانوں کے اندر بھی قصور وار موجود ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی دعوت کو اس کی ہمہ گیریت کی خصوصیت کے ساتھ پیش کیا جائے۔کفر کے فتوؤں کی بجائے دعوت کو دلائل سے مزین کیا جائے۔ ہر طبقے کو مخاطب کیا جائے اور مفادات سے بالا ہوکر خالص اللہ کی رضا کے لئے محنت کی جائے۔ دنیا کے ہر حساس مسئلے کو اسلام کی دعوت کا موضوع بنایا جائے اور امت مسلمہ کی زبوں حالی، اس کی بے بسی اور کم مائیگی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور خاص طور پر اسلامی جہاد کو صحیح شکل میں پیش کیا جائے ۔دعوت اور جہاد دونوں میدانوں میں منہجی اور عملی کام کی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کے ذہن واضح کئے جائیں اور مسلمانوں کے آپس میں ٹکراؤ ختم کیے جائیں ۔اس سے اسلام کی دعوت آگے بڑھے گی اور حکم اللہ کے قیام کے راستے استوار ہوں گے۔ ان شاء اللہ

ہماری عافیت اللہ کے حکم اور دین کو قائم کرنے میں ہی ہے:

ایک نظر اس پر بھی کہ آج دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ یہ دلخراش صورت حال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے باغیوں نے مسلمانوں کو باطل نظاموں کا باغی قرار دے کر ان سے حقوق چھین لئے ہیں۔ علاقوں پر قبضے کر لئے ہیں اور اللہ کے سچے داعی مسلمانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ اس ظلم کو برداشت کر کے بیٹھے رہنا اور دعوت

کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کرنا امت مسلمہ کا بہت بڑا جرم ہے۔ ہر مسلمان فرد، جماعت اور حکومت کو اپنے وسائل اور اثرات کی بنیاد پر اللہ کے دین کے اس مسئلے پر بھرپور اور فی الفور توجہ کرنی چاہئے ورنہ غلامیاں اور محرومیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ مسلمان اپنے ملک اور حقوق محفوظ نہیں رکھ سکیں گے اور ہم اللہ کے سامنے کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

مسلمانوں کو پہلے اپنے دفاع کی جنگ لڑنی ہے اور جہاں مسلمانوں کو اللہ قوّت عطا فرمادے، وہاں اللہ کا حکم قائم کرنا ہے اور اللہ کے حق کے لئے اللہ کے باغیوں اور طاغوتوں سے لڑنا ہے۔ تا آنکہ روئے زمین پر اللہ کا حکم قائم ہوجائے اور طاغوتوں کے سب حکم اور سب نظام مغلوب ہوجائیں۔

دین محض حکومت کے حصول کا نام نہیں:

افغانستان کے حالات و واقعات سے قطعاً غلط مطلب نہیں لینا چاہئے۔ یہ سوچ غلط ہے کہ وہاں مسلمان اگر جہاد نہ کرتے تو ان پر ظلم نہ ہوتا لہٰذا کشمیر و فلسطین یا کہیں اور بھی جہاد کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ آج کفر زوروں پر ہے۔ کہا جاتا ہے بس وقت کا انتظار کیجئے اور اپنی نماز روزہ ادا کرتے رہئے یا زیادہ سے زیادہ تبلیغ کے کچھ کلمے پڑھا کر اپنا فرض پورا کیجئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ افغان اگر جہاد نہ کرتے اور روسی غلامی کو قبول کرتے تو ان کا حال وہی ہوتا جو روسی ریاستوں میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے جہاد کیا، اللہ نے انہیں بڑی غلامی سے بچالیا۔ امریکہ کے ظلم کے بعد آج افغانستان میں عبوری حکومت والے اگر حکومت میں آئے ہیں تو وہ بھی افغانستان میں شرعی قوانین کے نفاذ کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ مجاہدین کی قربانیوں کا نتیجہ ہے، انہی قربانیوں سے کمیونزم کی یلغار رکی، اسی سے صلیبی یلغار بھی رکے گی۔ ان شاء اللہ

افغان معاشرے میں آج بھی اسلام کے گہرے سائے ہیں۔ مجاہدین صرف حکومتوں کے حصول اور کرسیوں کے لئے قربانیاں نہیں دیتے۔ وہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے قربانیاں دیتے ہیں۔قربانیوں کا بہرحال فائدہ ہوتا ہے۔

دین قائم کرنے سے مرادصرف حکومت قائم کرنا نہیں ہوتا۔حکومت بھی ایک ذریعہ ہے لیکن مسلمان اسلام کے عمل پر قائم ہوں اور دعوت و جہاد کے لئے قربانیاں دینے والے نکلتے رہیں، تو اس سے بھی دین قائم رہتا ہے۔حکومت کے تصور نے اور محض اس کے لئے تمام توانائیاں صرف کرنے کے کام نے اسلامی جماعتوں کو جمود کا شکار کر دیا ہے۔ مایوسیوں سے نکلنے اور جمود توڑنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ دعوت و جہاد کو صحیح منہج میں چلایا جائے۔مسلمانوں کو مادیت کے خلاف بڑی جنگ لڑنے کی تیاریاں کرنی ہیں، سوچیئے یہ تیاریاں کہاں ہورہی ہیں ۔حقیقت یہ ہے کہ کفرو طاغوت نے ان کو ہی نشانہ بنایا ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ کا پراپیگنڈہ اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں دین کا گہرا رنگ باقی ہے۔امریکی اور اتحادی فوجیں اس رنگ کو نہیں اتار سکیں گی اور طاقت اور لالچ کے زور پر آنے والے لوگ افغانستان کو کفر کا غلام نہیں بنا سکیں گے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں جاری رہنے والے جہاد نے وہاں اسلامی دعوت وعمل کو گہرا کر دیا ہے۔

اور یاد رکھئے اللہ کے لئے کیا ہوا عمل اور اللہ کے لئے دی ہوئی قربانی کبھی ضائع نہیں ہوتی ۔اس کے اثرات دنیا ضرور دیکھے گی اور اللہ کے لئے بہایا جانے والا خون رنگ دکھائے گا۔ کفرو طاغوت کے خلاف لڑتے ہوئے مسلمان شہید ہوجاتے ہیں، گرفتار ہوجاتے ہیں اورزخموں سے چور ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات افغانیوں کی طرح پوری قوم ہی زخمی ہوجاتی ہے، لیکن ایسی قوموں پر غلامی کا داغ نہیں لگتا، وہ ناکام نہیں

ہوتے۔ ناکام وہ مسلمان ہوتے ہیں جو کفر کی غلامی قبول کر کے طاغوت کے سامنے سرنڈر ہوجائیں۔ ان کا سارا اثاثہ ضائع چلاجاتا ہے اوردوبارہ سے ان کا اٹھنادشوار ہوجاتا ہے۔ آفرین ہے افغان مجاہدین پر کہ انہوں نے دنیا کے فرعونوں کے سامنے جھکنا قبول نہیں کیا۔ان کی نسلیں اٹھیں گی اور کفر سے لڑیں گی۔ اللہ توفیق سے نوازے گا۔ تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا ہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کی اپنی غلطی سے باغ اجڑے ہیں، غداریاں ہوئی ہیں، بہت نقصان اٹھانے پڑے ہیں۔لیکن اللہ کے لئے کیا ہوا عمل باقی رہتا ہے۔ مسلمانوں کو بس یہ سمجھ کر کفار کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو لوگ مادی نتائج کو معیار قرار دے کر حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کبھی حقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ مادیت ان کو دھوکہ دیتی ہے اور وہ دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مادیت کے پرستاروں کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اسلام پر استقامت اختیارکریں اور اللہ کے حکم کے قیام کی کوشش کریں۔

حاکمیت کے بیان میں حالات کی بحث اس لئے ضروری ہوگئی تھی کہ آج سخت مقابلہ اس بنیاد پر کیا جارہا ہے کہ جہاں بھی الحکم للہ کے لئے کوشش ہوئی ،وہاں طاغوت پوری قوت استعمال کر کے اس کوشش کو روکتے رہے ۔ترکی میں ایسا ہی ہوا ہے۔ پھر عالم اسلام میں ہر جگہ یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ الجزائر اور افغانستان میں قوت استعمال کی گئی اورکشمیر و فلسطین میں بھی جو جہاد جاری ہے، اس کے لئے یہی پروگرام ہیں۔ مسلمان گھبرائیں نہیں بلکہ اللہ کی خاطر قربانیاں پیش کر کے اپنافرض ادا کریں اور اپنی نجات کا اہتمام کریں۔ کفار کے حربوں کو خوب سمجھیں ۔ان کے معاہدات، مذاکرات اور بین الاقوامی رابطے اور ڈھانچے ادارے سب اسلام کو روکنے کے لئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں او رغلامی کا پورا پیکج قوموں کے سامنے پیش

کرتے ہیں ۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومتیں ان کے پیکج مانتی اوران کے کام آتی ہیں۔یہ وقت مشکل ضرور ہے ، رکاوٹیں بہت زیادہ ہیں لیکن اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے چلنا ہی مسئلے کا حل ہے۔ مایوس ہوجانا، رک جانا اور ہمت ہارجانا ہلاکت ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے لئے راستہ کھولتا ہے۔ آزمائش ضرور کرتا ہے لیکن استقامت اختیار کرنے والوں کی مدد کرتا ہے اور مشکلات آسان ہوجاتی ہیں۔ اللہ کی رحمت اور نصرت کی امید رکھئے اور جوکچھ پاس ہے، اللہ کے لئے پیش کردیجئے۔ہاتھ خالی ہوجائیں تو وہی اللہ کے سامنے اٹھا دیجئے، یہی انبیاء ،صدیقین اور صالحین کا شیوہ رہا ہے۔کبھی اپنی مجبوریاں بندوں کے سامنے نہ رکھئے۔ اپنے دکھ درد اللہ کے سامنے پیش کیجئے اور دنیاوالوں کے سامنے کسی کمزوری کااظہار نہ کریں۔ اِنَّمَااَشْکُوْبَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہ ’’اے اللہ ! میں اپنی کمزوری ، بے بسی اورغم کی شکایت تجھ سے ہی کرتا ہوں۔‘‘

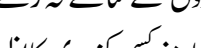

پچھلے دروس میں توحید کا مفہوم بیان کیا گیا اور اس کی اقسام کی وضاحت کی گئی۔ اب توحید کے فوائد اور اس کی بنیاد پر اصلاح کی منہجی بحث پیش کی جاتی ہے۔

توحید کے فوائد درج ذیل ہیں:

۱۔ دنیا میں ہدایت کا سب سے بڑا باعث توحید ہے۔

۲۔ توحید گناہوں کے کفارے کا موجب ہے۔ اگر توحید صحیح ہے تو اللہ باقی گناہوں کو توحید کے وسیلے سے معاف کردے گا۔

۳۔ اللہ کی پکڑ سے بچاؤ توحید کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ دوزخ کے عذاب

سے نجات توحید کے ساتھ ملے گی۔

قرآن میں اس کی واضح دلیلیں ہیں۔فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ آمَنُوا وَ لَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُھْتَدُوْنَ ﴾ (الانعام.....)

’’یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم (شرک) کو شامل نہیں کیا تو وہ لوگ امن میں ہوں گے اور وہی ہدایت والے ہیں۔‘‘

سورہ النساء میں فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَالِکَ لِمَن یَّشَآءُ ﴾

’’یعنی اللہ نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس (شرک) کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا۔‘‘

نبی ﷺ نے فرمایا کہ

« حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰہِ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَن لَّا یُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا »

’’یعنی بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو اسکے ساتھ شرک نہیں کرتے ،وہ انہیں عذاب نہ کرے۔‘‘ (الحدیث)

حقیقت یہ ہے کہ قوموں اور معاشروں کی اصلاح توحید ہی کے ساتھ ممکن ہے۔ انبیاء کا منہج یہ ہے کہ دین کی بنیاد توحید پر ہے اور ہر طرح کی گمراہی کی بنیاد شرک ہے۔قوموں میں قتل وفساد ،عزتوں کا لٹنا اور حقوق کے غصب کی اصل بنیاد یہ رہی ہے کہ لوگوں نے اللہ کے حقوق پامال کئے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ کا حق غصب ہواور بندوں کے حقوق محفوظ ہوں۔اس لئے تمام انبیاء نے ہر قسم کا بگاڑ ختم کرنے کیلئے توحید کی دعوت دی۔قرآن نے قوموں کی تاریخ میں واضح کیا ہے کہ ہر قوم جس پر اللہ کا

عذاب آیا وہ توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کرتی تھی، بے حد اخلاقی برائیوں کا شکار تھی، خاص طور پر چند بُری قوموں کا اللہ نے بار بار ذکر کیا ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم اور قوم عاد وثمود میں طبقاتی تقسیم تھی۔ چھوٹے لوگوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، بڑے چھوٹوں پر ظلم کرتے تھے۔ طاقت کا نشہ وتکبر اس قدر تھا کہ انبیاء کو جھٹلانے میں اس کا بڑا دخل تھا۔ قوم لوط میں اخلاقی گراوٹ کی انتہا درجے کی تھی کہ ہم جنس پرستی کے گھناؤنے جرم میں اکثر ہی شامل تھے اور قوم شعیب میں کم تولنے اور دھوکہ دہی کا مرض عام تھا۔ کرپشن میں ہاتھ کی صفائی دکھاتے تھے۔ اسی طرح دیگر اقوام میں بھی خرابیاں تھیں۔ خاتم النبیین ﷺ کی آمد پر عربوں میں بھی ظلم وجبر کی انتہا تھی۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی سب قوموں کی خرابیاں ان میں پائی جاتی تھیں۔ ان تمام اقوام کی اصلاح کے لئے آنے والے انبیاء نے منہجی طور پر مرض کی تشخیص کرتے ہوئے انہیں توحید کی دعوت دی اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ وابستگی پیدا کرکے امور کی اصلاح کی۔ جب لوگوں کا اللہ سے تعلق درست ہوجاتا ہے تو ان کے آپس کے تعلقات بھی درست ہوجاتے ہیں۔

توحید کی دعوت ہی دین کی دعوت ہے۔ اگر توحید نہ ہو اور اس کے علاوہ قوموں کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور کسی حد تک بعض خرابیوں کی اصلاح ہو بھی جائے پھر بھی یہ نہیں ہوسکتا کہ جملہ برائیاں ختم ہوجائیں اور قوم اصلاح کی راہ پر گامزن ہوجائے۔ اگر ایک خرابی دور ہوگی تو دوسری بہت ساری برائیاں جنم لیں گی۔ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام کو ظلم کا نظام کہہ کر کمیونزم کا فلسفہ ایجاد کیا گیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ایک طبقے کا استحصال ختم ہوا تو دوسرے استحصالی طبقے پیدا ہوگئے اور حالات پہلے سے بھی بگڑ گئے۔ آخرکار کمیونزم جہاں پیدا ہوا وہیں دفن ہوگیا۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے

معاشروں میں سماجی آزادیوں کے نام پر کام کرنے والوں نے وہ بگاڑ پیدا کیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے اور ایک قوم دوسرے قوم کے لئے ہلاکت کا باعث بن گئی۔ آج بھی طاقت کا فلسفہ کارفرما ہے اور شہوات کا ایک طوفان برپا ہے جس میں انسانیت خودکشی کر رہی ہے۔ طاقت کو جاہلیت سے تعبیر کرنے والا یورپ آج خود اس نظام کا حامل ہے۔ اخلاق اور قانون کے محض دعوے رہ گئے ہیں۔حقیقت غائب ہوگئی ہے۔مشرق ومغرب میں فساد ہی فساد ہے۔ ہرطرف ظلم ہے۔حقوق انسانی کے نام لیوا آج بہت بڑے ڈاکو بنے ہوئے ہیں اور حقوق کے نام پر بننے والے ادارے قوموں کے قتل کے ذمہ دار ہیں..... ان حالات میں مسئلہ کا حل صرف اسلام کے پاس ہے جو توحید کا داعی ہے۔ انسان اور انسانیت کی فلاح کا نظام اسلام پیش کرسکتا ہے، لیکن خود اسلام کو بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔مسلمانوں نے اسلام کو فرقوں میں تقسیم کرلیاہے۔فرقہ بندی نے اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور اس کی جان نکال دی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ مسلمانوں میں بنیادی طور پر عقیدہ میں بڑی بڑی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ غیر مسلم جن باطل عقائد کے حامل ہیں مسلمان تقریبا انہی عقائد کو مختلف ناموں اور طریقوں سے اختیار کئے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر عقیدہ توحید میں مسلمانوں میں بڑا بگاڑ پایا جاتاہے۔ ہندوٴوانہ عقائد مسلمانوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور نصرانیت اور یہودیت کے عقیدے بھی مسلمانوں میں ملیں گے۔ اگر ہندو وحدت الوجود کے قائل ہیں تو مسلمانوں میں اس عقیدہ کے حامل لوگ بہت ہیں۔ خال خال ہی مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ اللہ عرش پر ہے۔ اکثر کہیں گے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ حلول کے ہندووانہ عقیدہ کے حامل مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ پیرو مرشد سے وابستگی کے عقیدے نے حلول کا نظریہ عام کردیا ہے۔ اکثر لوگ بحث کریں گے کہ میرا مرشد

خدائی صفات کا حامل ہے۔ فلاں فلاں کرامات کا ظہور کر چکا ہے۔ عام آدمی کو باور کروادیا جاتا ہے کہ پیر صاحب صرف ظاہر میں انسان ہیں باطن میں نعوذ باللہ ان کی روح کا اللہ سے اتصال ہو چکا ہے۔ ان سے جو چاہو مانگو، سب کچھ دینے پر قادر ہیں۔ پھر ان کے مختلف نام رکھ لئے جاتے ہیں جو سب خدائی صفات ظاہر کرتے ہیں اور اس طرح آستانوں پر حاجات طلب کرنے والوں اور نذرو نیاز پیش کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بہت سا لٹریچر ایسا ملتا ہے جو صریحاً ہندو کے لٹریچر سے ماخوذ ہے۔ آج مساجد میں آبادی کم اور کلمہ گو مسلمانوں اور عبادت گزاروں کی بھیڑ قبروں اور بزرگوں کے مزاروں پر زیادہ نظر آئے گی۔ ہندوستان اور پاکستان بلکہ مسلمانوں کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ سلسلہ بہت زیادہ پھیلا ہوا ملے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت ان عقائد میں مبتلا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ عقیدہ کے اس بگاڑ نے بہت سے بگاڑ پیدا کئے ہیں۔ جب اللہ کے ساتھ ایک کو شریک کیا تو بہت سے شریک ہوتے جاتے ہیں۔ اسی سے سلسلے اور وابستگیاں جدا جدا ہوتی رہتی ہیں۔ عقیدۂ توحید ہی وحدت انسانیت کی ضمانت ہے۔

اللہ نے قرآن میں پہلی قوموں کے حوالے سے فساد فی الارض کے نقشے کھینچے ہیں اور اصول بیان کئے ہیں۔ وحدت اور اختلاف کی حقیقت بھی بیان کی ہے۔ سورہ یونس میں واضح کیا ہے کہ پہلے ایک ہی امت تھی اور سب لوگ توحید پر قائم تھے لیکن جب شرک آ گیا تو انسانوں میں اختلاف پھوٹ پڑا۔ انبیاء نے انسانوں کو توحید کی طرف بلایا اور اختلاف سے وہی لوگ بچے جنہوں نے انبیاء کی دعوت توحید کو تسلیم کیا اور جو اختلاف کرتے رہے، وہ توحید کے خلاف بغاوت کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹتے چلے گئے اور ان میں سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ یہی سرکشی گناہوں اور جرائم کا موجب بنی

اور انسان ایک دوسرے کا دشمن بنا۔قومیت اور رنگ ونسل کے تعصّبات اسی سے پھیلے، اسی خرابی کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو نقصان پہنچایا اور اس طرح فساد پھیل گیا۔ قوموں اور علاقوں کے درمیان لڑائیاں چھڑ گئیں، تباہیاں ہوگئیں۔ جب تباہی انتہا پر پہنچ جاتی تو اللہ نبی بھیج کر اصلاح کرتا۔ جو مانتے وہ بچ جاتے اور منکرین فسادیوں پر عذاب نازل ہوتے۔ اس طرح انسانیت کو اللہ نے فساد سے بچا کر پھیلایا۔

خالق و مالک اللہ نے اختلاف کا باعث شرک کو بتایا ہے اور اسی کو بحر و بر میں فساد کا موجب قرار دیا ہے۔ انبیاء کے منہج میں قوموں کی اصلاح کا طریق بھی یہ رہا ہے کہ وہ توحید کی دعوت دے کر لوگوں کو اللہ سے وابستہ کرتے۔ توحید کی خوبی یہ ہے کہ اس سے اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف بندوں میں پیدا ہوتا ہے۔ توحید سے ہی رسالت اور آخرت پر ایمان پختہ ہوتا ہے۔ لوگ آسمانی دین کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ انسانوں کے بگاڑ کا یہ علاج اللہ نے بتایا ہے۔ انبیاء حکیم تھے، انہوں نے قوموں کا علاج کیا ہے۔ سورہ الشعرآء، ہود، یونس الاعراف، الحجر اور دیگر بہت سی سورتیں اسی مضمون کو بیان کرتی ہیں.....

توحید سے دوری شخصیت پرستی کو جنم دیتی ہے:

مسلمانوں میں حاملین تصوف نے بھی اگرچہ لوگوں کو اللہ سے وابستہ کرنے کے طریقے اختیار کئے ہیں لیکن انہوں نے انبیاء کی توحید سے الگ طریقے اپنائے ہیں۔ جنہیں ان کی ذہنی کاوشیں تجربات یا فلسفے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے صوفیاء کے سلسلے تو بہت چلے لیکن وہ اصلاح نہیں ہوسکی جو امت کو مقصود تھی۔ تکلف تو بہت ہوا لیکن حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکا اور ان محنتوں کا فائدہ اسلام کو حاصل نہیں ہو سکا۔

کفر پر زد نہیں پڑی۔ اگر کسی اللہ کے نیک بندے نے کسی علاقے میں دین کی دعوت پھیلائی ہے تو بعد میں اس کے نام پر کرامات کہیں زیادہ پھیلائی گئی ہیں۔ اس سے شخصیت پرستی نے جنم لیا ہے۔ اس سے دین کی اہمیت کم تر ہوتی جاتی ہے اور شخصیت اجاگر ہوتی چلی جاتی ہے۔ شخصیت سے وابستگی کو ہی دین سمجھا جاتا ہے اور اس کی ہر بات دین بن جاتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ فوت شدہ بزرگوں نے وہ باتیں کہی بھی نہیں ہوتیں جو ان کے نام سے منسوب ہو کر پھیلتی رہتی ہیں۔ ان کی قبریں مرجع خلائق بن جاتی ہیں۔ قبروں پر عرسوں اور میلوں کے ذمہ دار بسا اوقات تختیاں لگا دیتے ہیں کہ ان پر سجدہ کرنا جائز نہیں لیکن کوئی نہیں مانتا۔ لوگ سجدے بھی کرتے ہیں اور مرادیں، حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ ان کے علماء کہتے ہیں کہ ہم بزرگوں کو صرف وسیلہ بناتے ہیں کہ ان کے وسیلے سے اللہ سے مانگو لیکن عام لوگ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ سیدھا بزرگوں کو ہی حاجت روا سمجھ لیتے ہیں اور ان سے مانگنے کو ہی صحیح سمجھتے ہیں ۔ ظاہر ہے جب کسی بزرگ کا نام گنج بخش اور داتا رکھا جائے گا۔ جب یہ عقیدہ رکھا جائے گا کہ وہ لوگوں کی حاجتیں سنتے ہیں چاہے وہ وسیلہ سے سنتے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو اللہ سے لے کر دینے کا وسیلہ ہیں تو عام لوگوں پر وہی اثر ہوگا جو نظر آ رہا ہے۔ علماء اور بہت سے پڑھے لکھے لوگ شرک کو برا تصور کرتے ہیں اور بچنا بھی چاہتے ہیں اسی لئے غیر اللہ کے لئے سجدے کی مخالفت کرتے ہیں۔ قبروں پر بھنگڑے، ڈھول، تماشے اور میلے وغیرہ کو پسند نہیں کرتے لیکن ان کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے توحید کے حساس مسئلے کو قرآن سے نہیں سمجھا۔ اللہ کے نبیوں کی توحید کی بجائے غیر مسلموں کے وحدت الوجود وغیرہ کے فلسفے اختیار کئے اور قرآن کی تاویلیں کر کے اپنے عقائد کو ثابت کرنے کی کوشش کی جس سے عوام نے راستے نکالے۔ آج

عام لوگ شرک سے اس طرح نفرت کرتے ہیں جس طرح وہ اسلام سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ صرف اسلام کا نام رہ گیا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے اکثر کام اسلام کے خلاف نظر آئیں گے لیکن محبت میں کوئی کمی نہیں سمجھتے۔ اسی طرح شرک سے نفرت ہے لیکن عملاً وہ سب کچھ موجود ہے جو شرک کے ضمن میں آتا ہے۔ جس سے نبی منع کرتے رہے۔

اصلاح اور دعوت کا طریقہ کار:

مذکورہ بحث کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جس طرح شرک سے پہلی قوموں میں بگاڑ آیا اور سارا فساد اسی سے پھیلا، اسی طرح منہج توحید سے ہٹنے کی وجہ سے آج مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ قرآن کے بیان کے مطابق پہلے بھی دو ہی بنیادی خرابیاں تھیں اختلاف اور دنیا پرستی اور اب بھی وہی اختلاف اور مادیت ہے۔ پہلے بھی اصلاح توحید کی دعوت کے ساتھ کی گئی۔ اب بھی طریقہ وہی ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی نے امت کے وجود کو پارہ پارہ کردیا ہے اور عام لوگ دین سے دور ہو کر مادیت کی مصیبت میں ایسے گرفتار ہوگئے ہیں کہ دین کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہی نہیں۔ آخرت یاد ہی نہیں۔ حساب کی فکر ہی نہیں۔ جب عقیدہ نہیں تو عمل کہاں۔ عمل عقیدے کی پیداوار ہے۔ جس طرح بیج سے درخت اگتا ہے۔ اسی طرح عقیدے سے عمل پیدا ہوتا ہے۔

انسانوں کی مثال ایسے ہے جیسے زمین کو تیار کیا جائے۔ اس میں توحید کا خالص آسمانی بیج بویا جائے۔ اس کی پوری نگہداشت کی جائے۔ پھر فصل تیار ہوتی ہے۔ داعی حضرات کو انبیاء کا طریق سامنے رکھ کر محنت کرنی چاہئے۔ انبیاء انسانوں کے کتنے ہمدرد تھے۔ جس طرح زمین میں محنت کرنے والا زمین کے ٹکڑے کو اپنا سمجھ کر جانفشانی

سے کام کرتا ہے۔ زمین کو ہموار کرتا ہے۔ ہل چلا کر اور پانی لگا لگا کر نرم کرتا ہے۔ محنت سے بیج ڈالتا ہے۔ بارش کی دعائیں اللہ سے کرتا ہے۔ آفات سے ڈرتا ہے۔ کیڑوں اور سنڈیوں سے فصل کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ باغ کے ارد گرد باڑ لگاتا ہے۔ ایک ایک بوٹے کی حفاظت کرتا ہے۔ فصل پر پہرے دیتا ہے۔ کوئی جانور باہر سے داخل نہ ہوجائے اور کوئی بیماری اندر سے فصل کو نہ لگ جائے۔ محنت کہیں ضائع نہ ہوجائے۔ فصل کسی مرحلے پر خرابی کا شکار نہ ہوجائے۔ یہ دہقان کی سوچ اور محنت ہے۔ وہ سخت موسم اور تیز ہواؤں میں کھیتی کے ارد گرد رہتا ہے۔ سردیوں کی راتیں اور گرمی کی دوپہریں فصل کے پاس گزارتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اسے اپنا سمجھتا ہے۔ اسے نفع کی امید ہوتی ہے۔ وہ سال گزارنے کے وسائل اور خوراک اس سے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے کمائی کرتا ہے..... سبحان اللہ! انبیاء کی محنتیں کس قدر زیادہ تھیں۔ آج بھی داعیان کا منہج وہی ہونا چاہئے۔ مسئلے کا حل توحید کی دعوت ہے۔ لیکن دعوت کے تقاضے اور اس کیلئے محنت بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے (بہت سے) داعی حضرات نے توحید اور اس کی دعوت کو سمجھا ہی نہیں۔ پیش کیا ہی نہیں۔ اگر آج مسلمانوں میں شرک کرتے ہوئے لوگوں کے گروہ ملیں گے تو ان کے مقابلے میں توحید پیش کرنے والے بھی ایک فرقے کے طور پر نظر آئیں گے۔ اجنبیت اور فاصلے ہیں۔ مخالفت ہی مخالفت ہے۔ سوچ اور اپروچ کا فرق ہے۔ توحید اور دین کی دعوت کم، فرقے کی دعوت زیادہ ہے۔ عقیدہ میں ان مسائل کو چھیڑا جاتا ہے جو عامۃ الناس کی سمجھ سے ہی بالا ہوتے ہیں۔ ان کی ضرورت ان کو ہوتی ہی نہیں۔ عقیدہ آج فلسفہ بن گیا ہے۔ اس میں علماء کی کوتاہیاں بہت زیادہ ہیں۔ داعیان توحید کو اپنی غلطیاں تسلیم کرنی چاہئیں۔ دعوت کوئی لذت نہیں ہے۔ لوگوں کو خوش کرنے کیلئے نہیں ہے۔ اگر

ایک خوش ہوگا تو زیادہ ناراض ہوں گے۔ خوش وہ ہوئے جنہیں دعوت دینا مقصود ہی نہیں تھا اور ناراض ہوکر دور وہ بھاگے جن کو دعوت پہنچنا چاہئے تھی۔ سوچئے کیا حاصل ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ سمجھتے ہوئے بعض داعی حضرات خود کو ایک دائرے میں بند کر لیتے ہیں۔ ایک خاص طبقہ ان کی مدح سرائی کرتا ہے۔ پھر آج کل تو دعوت ایک نفع بخش کام بھی بن چکا ہے۔ ان حضرات کی بڑی مانگ ہے جو مخالف کو خوب کوسنے دیں۔ منبر ومحراب سے دشنام طرازی کرسکیں، مذاق اڑا سکیں اور لوگوں کے ذوق فرقہ پرستی کو تسکین دے سکیں۔ تھوڑا سا ماضی میں جاکر دیکھیں تو نظر آئیگا کہ انگریز نے یہ راستے کھولے تھے انگریز کی ضرورت تھی کہ وہ ہند میں مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کرے۔ اسے ہندو سے خطرہ نہیں تھا مسلمان سے اسے شدید خطرہ تھا۔ وہ مسلمانوں کے جہاد سے خائف تھا۔ انگریز نے محنت کرکے سازشوں کے بیج بوئے۔ فرقے مضبوط کئے بہت سے علماء غیر شعوری طور پر استعمال ہوئے۔ مصیبت یہ ہے کہ اب بھی وہی رجحان چل رہا ہے.....

دعوت دین کی بنیاد قرآن وحدیث ہے:

ہمارے داعیان علماء کو سمجھنا چاہئے کہ توحید حقیقت میں اسلام کی دعوت ہے۔ لوگ اسلام سے محبت کرتے ہیں لیکن توحید کو نہیں سمجھتے۔ تصوف کا سلسلہ الگ طور پر رائج ہوا، جس نے دین کے فہم کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ عام لوگ تو کیا اکثر علماء بھی عقیدہ سے واقف نہیں۔ تاویلوں کے رجحان نے حقائق کو تبدیل کردیا۔ ان حالات میں ایسے پختہ علماء اور ہمدرد داعی چاہئیں جو امت کو درپیش مشکلات ومسائل کا ادراک کرکے لوگوں کو دعوت دیں۔ فتویٰ لگانے کا رجحان ختم کریں۔ دلیل اور ہمدردی کے ساتھ اصلاح

کریں۔ قرآن دعوتِ توحید کی کتاب ہے اور کتب حدیث عقیدہ کی اصلاح کے لیے بے حد مفید ہیں۔ قرآن وحدیث سے عام مسلمانوں کو محبت ہے۔ داعیان کو چاہئے کہ وہ قرآن وحدیث کی طرف لوگوں کو لے کر آئیں۔ قرآن پڑھیں اور سادہ ترجمہ سنائیں۔ اسی طرح حدیثیں پڑھنے سے بڑی برکت ہوتی ہے۔ بحث کا ماحول پیدا نہ کریں۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی معروف باتوں کو اٹھانے کی بجائے انبیاء کے قرآنی وعظ سنائیں اور قرآن پکڑ کر سنائیں۔ سننے والے کو یقین ہوجائے کہ اپنی باتیں یا اپنے فرقے کے مسئلے نہیں بیان کر رہا بلکہ داعی مجھے قرآن سنا رہا ہے۔ آج پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ انہیں ترجمہ سناتے ہوئے دکھایا جائے تو زیادہ مفید ہوگا عموماً لوگ قرآن وحدیث سے ہٹ کر قصے کہانیاں اور ان پر لکھی ہوئی کتابیں رکھتے ہیں۔ اکثر مساجد میں مولوی حضرات بھی عامۃ الناس کو وہی سناتے رہتے ہیں۔ لیکن دعوت توحید کے داعی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ بعض اوقات دوسری چیزوں سے فائدہ ہوجاتا ہے۔ بعض لوگ دعوت کو مان بھی لیتے ہیں لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ آخر شرکیہ باتیں منوانے والے بھی تو لوگوں کو باتیں منوا لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی تو لوگ ہوتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی بات نہیں کہ آدمی اپنے تجربات سے ہی فائدہ اٹھاتا رہے اور اسی پر دعوت پھیلاتا رہے۔ بعض لوگ باصلاحیت ہوتے ہیں ۔ کام کرجاتے ہیں لیکن جب مقصود دعوت کا میدان بنانا ہو، عام ساتھیوں کو دعوت دینے کیلئے تیار کرنا ہو اور دعوت گھر گھر اور قریہ قریہ پہنچانی ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ساتھی قرآن خود پڑھیں اور خوب سمجھیں۔ علماء نوجوانوں کو قرآن پڑھنا سکھائیں اور انہیں اچھی طرح سمجھائیں۔ اسی طرح حدیث کا پڑھنا پڑھانا عام ہو۔ پڑھنے اور پڑھانے والے لوگ قرآن وحدیث کے ساتھ گہری وابستگی رکھیں۔ بہت محبت کریں کثرت سے خود پڑھیں۔ تہجد میں قرآن

کی تلاوت کریں، حدیث کو زیادہ پڑھتے رہا کریں۔ قرآن وحدیث کو اپنے عمل میں لائیں۔ اپنے گھروں کے نقشے بدلیں۔ اپنے اخلاق واعمال میں قرآن وحدیث کو جاری رکھیں ایسے لوگ جب قرآن وحدیث کے ساتھ دعوت دیں گے تو اثر ہوگا۔ یہ بات یقینی ہے کہ جتنا انسان پر ذاتی طور پر اثر ہوتا ہے، وہ اتنا دوسرے پر بھی موثر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر تکلف ہے۔ کسی کی آواز اچھی ہے، لوگ آواز کا لطف اٹھائیں گے۔ کسی کے بیان کا انداز اچھا ہوگا، اس سے متاثر ہوں گے۔ بعض اپنے علم کا رعب رکھتے ہیں۔ ان کی شہرتیں لوگوں کو ان کی ذاتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ لیکن دعوت نہیں پھیلتی۔ عقیدے نہیں درست ہوتے رنگ نہیں بدلتے۔ لوگ اکٹھے ہوجاتے ہیں، جماعتیں بن جاتی ہیں لیکن مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

سلف کا اسلوبِ دعوت:

ہم سلف کے اسلوب دعوت کو سمجھیں۔ وہ اسلوب بڑا سادہ تھا۔ علم کے ساتھ عمل تھا۔ تقوی اور صبر تھا۔ تکلف ہرگز نہیں تھا۔ مفاد بالکل نہیں تھا۔ ہمدردی تھی۔ حقیقی علم کی روشنی تھی اور کام میں لگن اور محنت تھی۔ اور اللہ سے اجر کی امید تھی۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے توحید کو اس طرح سمجھایا ہے کہ پورے دین کو اسی مسئلے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انسانی مسائل وضروریات میں توحید سمجھائی ہے۔ کوئی مسئلہ انفرادی ہو اجتماعی ہو سیاسی ہو یا معاشی اور معاشرتی ہر مسئلے کو توحید سے وابستہ کردیا۔ اس سے انسان سادگی کے ساتھ سمجھتا ہے کہ ہم نے جملہ امور اور معاملات میں اللہ کا حکم ماننا ہے۔ ہم نے ہر چیز اللہ سے لینی ہے۔ ہمارا ہر معاملہ اللہ سے وابستہ ہے، پوری زندگی پر دین اسی طرح جاری ہوگا کہ اللہ سے اس کا تعلق جڑ جائے گا۔ یہ ذہن بنا کر وہ قرآن وحدیث سے

ہر مسئلے کا استدلال کرتے ہیں۔ ہر ذہن کو قرآن وحدیث کی طرف کھینچتے ہیں۔ سلف کے ہاں، علماء مجتہدین کے ہاں یہی اسلوب عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یہی لوگ حقیقت میں فتنوں کے دور میں اسلام کے صحیح نمائندے تھے اور ان کی دعوت تمسک بالکتاب والسنہ کے ساتھ وہی ہے۔ یہ لوگ اصلاح کر سکے ہیں۔ آج بھی اسی طرح ممکن ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ موجودہ فتنہ وفساد اور انسانی مسائل کے انبار میں اسلام کی دعوت ہی حل ہے۔ یہ دعوت توحید کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ لوگ دعوت کے اہل ہوں گے جو مذہبیت اور فرقہ پرستی سے نکل کر خالص کتاب وسنت کی بنیاد پر اور پوری امت مسلمہ کے مسائل کو سامنے رکھ کر امت میں دعوت کو منظّم کریں گے، مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کریں گے اور پوری حکمت کے ساتھ دعوت دیں گے۔ خود ساختہ حکمتوں کے پردے میں دعوت کو نہیں چھپائیں گے اور نہ ہی تکفیر کا منہج اختیار کریں گے اور نہ ہی تکلف کرتے ہوئے دعوت کو مشکل مسئلہ بنائیں گے۔ بلکہ لوگوں کو سمجھائیں گے کہ انبیاء نے اسی منہج پر قوموں کی اصلاح کی تھی اور وہی دعوت لے کر اسی اسلوب ومنہج کے ساتھ ہم حاضر ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ دعوت موجود ہے۔ اور وسائل دعوت بھی موجود ہیں۔ وہ داعی چاہئیں جو دعوت کو اس کے حقیقی وسائل کے ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ ان کی تیاری ضروری ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کو کھڑا کردے، جو اس کے دین کے کام آجائیں۔ اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوں۔ اور اللہ اس کام میں برکت دے اور قبول فرمالے اور اللہ ہمیں ان کا ساتھی بنادے، جو توحید کے داعی ہوں اور دین پر قائم ہوں اور اللہ کے دین کو قائم کریں۔ اس طرح ہم دنیا سے جائیں کہ اللہ شہادت کی موت عطا فرمائے اور حساب کے بغیر جنتوں میں داخل کردے اور اسی امت کے پہلے داعی محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نصیب ہو۔

فرشتوں پر ایمان

گذشتہ اقساط میں اللہ کی توحید پر ایمان کے ضمن میں توحید ربوبیت ،توحید الوھیت ،توحیدالاسماء والصفات اور توحید حاکمیت کا تفصیل سے بیان ہوا۔ اب فرشتوں پر ایمان کا تذکرہ ہوتا ہے۔

فرشتوں پر ایمان کی حقیقت:

فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان کے بنیادی ارکان میں شامل ہے۔سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ [البقرة : ٢٨٥]

’’ رسول ایمان لائے، اس کتاب پر جو ان پر نازل ہوئی، ان کے رب کی طرف سے اور ایمان والے بھی سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اوراس کے رسولوں پر(اور کہتے ہیں کہ)ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔‘‘

حدیث جبرائیل میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ایمان کیاہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ’’ایمان یہ ہے کہ تواللہ پر، اس کے فرشتوں پر ،اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اورآخرت کے دن پرایمان لائے اور یہ کہ تو تقدیر کے خیروشر پرایمان لائے۔‘‘

اسی طرح قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر فرشتوں کا ذکر ایمان کے ارکان میں شامل کیا گیا۔ حدیث جبرائیل میں ایمان کے چھ ارکان بیان ہوئے ہیں۔فرشتوں پر ایمان ان میں سے ایک ہے۔

قرآن و حدیث کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں۔اللہ نے انہیں نور سے پیدا کیا ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔اللہ نے انہیں مختلف ذمہ داریوں پر متعیّن کیا ہے۔ ان کا خاصہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے کسی حکم کا انکار نہیں کرتے بلکہ جو اللہ کہہ دے، وہی کرتے ہیں۔فرشتوں کو ماننا ایمان بالغیب سے ہے کیونکہ یہ نظر نہیں آتے۔ان کے بارے میں اللہ اور رسول ﷺ نے جو بیان کردیا ہے، اسے اسی طرح مان لینا چاہئے ۔فرشتوں پر ایمان کا صحیح ذریعہ وحی ہے۔ انسانی علوم سے انکا صحیح ادراک ممکن نہیں۔ لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ایمانیات سے متعلق چیزوں کو حواس و عقل سے سمجھنے کی کوشش کی ہے جبکہ حواس اور عقل سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ انسان کے اپنے ذاتی وسائل کا مرہون منت ہے۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو انسان کی عقل اور اس کے حواس سے ماوراء ہیں۔ ان اشیاء کی حقیقت اللہ نے وحی کے ذریعے اپنے رسولوں کو بتائی اور رسولوں اور نبیوں نے وہ حقیقتیں انسانوں تک پہنچائیں۔ ایسی تمام چیزیں جو وحی کے ذریعے بتائی گئی ہیں، انہیں بیان کردہ علوم وحقائق کے ساتھ ماننا اور ان پر ایمان لانا ہے۔انسان کے حواس اور عقل کوتاہی بھی کرتے ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والا علم اگر صحیح ہوسکتا ہے تو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مختلف انسانوں کے حواس اور عقل ایک ہی چیز کے بارے میں مختلف اندازے بھی لگا سکتے ہیں لیکن وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا علم غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہوسکتا اور نہ ہی انسانی عقل و حواس کو وحی پر حاکم بنایا جا سکتا

ہے۔ البتہ وحی کو ہر چیز پر حاکم بنا کر اس سے حاصل شدہ علم کو قطعی یقینی مان لینا ایمان ہے اور اسی بنیاد پر ہم اللہ کی کتابوں پر، رسولوں پر اور فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ پیدا ہونے سے پہلے انسان کیا تھا اور کہاں تھا اور مرنے کے بعد انسان کے ساتھ کیا مراحل پیش آئیں گے، قبر کے ثواب و عذاب سے لے کر حشر، حساب اور جنت دوزخ تک ہر چیز کو ماننا ایمان ہے اور اللہ کا حکم ہر چیز پر غالب ہے اور سب تدبیروں پر اللہ کی تقدیر غالب ہوتی ہے۔ ان باتوں کو تسلیم کر لینا ایمان ہے۔ اسی کے ساتھ ہم مومن بنتے ہیں۔

شریعت کی رو سے فرشتوں پر ایمان واجب ہے اور ان کا انکار کرنا کفر ہے۔ سورۃ النساء میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ ﴾ [النساء : ۱۳۶]

''اور جو اللہ سے ، اس کے فرشتوں سے، اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت سے کفر کرتا ہے، وہ دور کی گمراہی میں جا گرتا ہے۔''

اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرشتوں کے بارے میں تین چیزوں کو واضح کیا ہے۔ انہیں بغیر کمی یا زیادتی کے تسلیم کرنا چاہئے۔

قرآن و حدیث میں فرشتوں کے متعلق معلومات:

اللہ نے قرآن میں بیان کیا کہ فرشتے انسان کی تخلیق سے پہلے موجود تھے:

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ﴾ [البقرۃ : ۳۰]

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اسی طرح فرشتوں کے مادہ تخلیق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا اور جنات کو آگ سے پیدا کیا گیا۔''

یہ نورانی مخلوق نظر نہیں آتی لیکن کبھی اللہ انہیں انسانی شکل میں ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسے سورۃ مریم میں ہے کہ:

﴿ قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکَ لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا ﴾[مریم : ۱۹/ ۱۹]

جبریل علیہ السلام مریم کے پاس انسان کی شکل میں آئے اور مریم کو اللہ کی طرف سے بیٹے کی خوش خبری دی۔ جب مریم ایک مرد کے پاس ہونے سے پریشان ہوئیں تو کہا کہ میں تو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں اور تجھے پاکباز بیٹے کی نوید دینے آیا ہوں۔

حدیث جبریل میں عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ اچانک ایک شخص بہت زیادہ سفید کپڑوں والا اور بہت زیادہ سیاہ بالوں والا، رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اسے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا اور اس پر سفر کے نشانات بھی نہیں تھے۔ دوزانو مؤدب بیٹھ کر نبی ﷺ سے سوالات کرنے لگا۔ حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی ﷺ نے وضاحت کی، یہ جبریل تھے جو تمہیں دین سکھانے آئے تھے۔ فرشتوں کے انسانی شکل میں آنے کی اور بھی روایات موجود ہیں۔

فرشتوں کی مزید صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے سورۃ الفاطر فرمایا ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○﴾ [الفاطر : ۱]

'' سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور

فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر ہیں۔''
اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے پر ہیں۔
بخاری و مسلم میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا، اس کے چھ سو پر ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے فرشتوں کی تخلیقی صفات واضح ہوتی ہیں۔ جس قدر معلومات ان کے بارے میں قرآن وحدیث یا دیگر اسلامی کتب سے میسر ہیں، انہیں اسی طرح تسلیم کرنا چاہئے۔ نہ کسی چیز کا انکار کرنا چاہئے اور نہ ہی غلو کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کے بارے میں سوالات اٹھانے چاہئیں۔ بحثوں اور جھگڑوں سے بچ کر اللہ اور رسول ﷺ کی بیان کردہ چیزوں پر ایمان لانا چاہئے۔
قرآن وحدیث میں فرشتوں کی متعدد ایسی صفات بھی بیان کی گئی ہیں، جن کا تعلق ان کی عبادت، اطاعت اور ڈیوٹی کے پورا کرنے سے ہے۔ سورہ الانبیاء میں ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ○﴾[الانبياء : ٢٦، ٢٧]

''اور انہوں نے کہا اللہ کی اولاد ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ کسی (فرشتے) کو اولاد بنائے بلکہ یہ تو عزت والے بندے ہیں۔ اللہ کے آگے بڑھ کر بول بھی نہیں سکتے اور وہ اس کے حکم سے عمل کرتے ہیں۔''
سورۃ النحل میں ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ ﴾

[النحل :٤٩، ٥٠]

''اور تمام جاندار جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے

ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے اور اپنے رب، جوان کے اوپر ہے، سے ڈرتے ہیں اور جوانہیں حکم دیا جاتا ہے، کام کرتے ہیں۔''

سورۃ الصفات میں ہے:

﴿ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ○ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ○﴾[الصافات: ۱۶۵]

''اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہرایک کا ایک مقام مقرر ہے اور ہم صف باندھے رہتے ہیں اور ہم اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔''

ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ نے فرشتوں کے ذمے کام لگائے ہیں۔ وہ انہیں ادا کرتے ہیں۔ شرح العقیدہ الطحاویہ میں ہے کہ آسمانوں اور زمین میں فرشتوں کو اللہ نے کاموں پر مقرر کررکھا ہے۔ سورج، چاند اور اجرام فلکی کے ساتھ فرشتے مقرر ہیں۔ پہاڑوں کے لئے الگ فرشتے ہیں۔ بادلوں کو چلانے والے، بارش کے فرشتے الگ ہیں۔ رحم مادر میں بچے میں روح پھونکنے کے لئے بھی اللہ نے فرشتے کو مقرر کیا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں تفصیل سے ہے کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ایک سو بیس دن کا ہوجاتا ہے، تو اللہ فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اللہ کے حکم سے چار چیزیں لکھتا ہے.....اس کا رزق.....اس کی موت.....اس کا عمل اور اس کا نیک بخت ہونا یا بدبخت ہونا۔ (صحیح مسلم)

اور موت کے لئے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے ساتھ ان کی حفاظت کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔ جن چیزوں کے ساتھ فرشتوں کے مقرر ہونے کا ذکر شرح العقیدہ الطحاویۃ میں ہے، ان سب کے بارے میں قرآنی آیات واحادیث موجود ہیں۔ کوئی چیز صاحب شرح نے اپنے پاس سے نہیں لکھی اور نہ ہی عقیدہ سے متعلق کسی چیز کے بارے میں اپنی عقل یا اندازے سے کچھ کہا جاسکتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کے درمیان پھیلی ہوئی کائنات میں ہرحرکت کوکنٹرول کررکھاہے اور اللہ کے طاقتور فرشتے ان کاموں پر مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کے ساتھ نظام کو چلارہے ہیں۔فرشتوں کا اپنا حکم یا فیصلہ نہیں ہوتااور نہ ہی کائنات میں وہ کوئی تصرف کرسکتے ہیں۔ اللہ نے ان میں انکار یااختیار کی قوت ہی نہیں رکھی۔ وہ بہت قوتوں کے مالک ہیں۔لیکن ان کی ہرقوت اللہ کے ارادے کے ساتھ چلتی ہے۔ یہی مفہوم ہے ان آیات کا جن کااوپر ذکر ہوچکاہے۔

کائنات کے غیبی حقائق اور سائنسی علوم:

اس سے یہ عقیدہ بھی واضح ہوجاتاہے کہ کائنات نہ خود پیدا ہوئی ہے اور نہ اس کا نظام خودبخود چل رہاہے ۔جیسا کہ بعض سائنسدانوں اور علوم کائنات کے محققین نے مختلف نقطۂ ہائے نظر پیش کئے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اور تدبیراللہ ہی کی طرف سے ہے۔ یہی عقیدہ صحیح ہے اور اس کے خلاف ہرعقیدہ باطل ہے۔ سائنسدان جتنے اصول اورکلیات وضع کریں ،ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی ذاتی کاوشیں ہیں اور عموماً دیکھا گیاہے کہ کل کے سائنسی حقائق آج بے حقیقت ہوچکے ہیں۔ خود سائنسدانوں نے اپنے پیش روسائنسدانوں کی نفی کردی ہے اور نئی تحقیق پیش کرکے نئے نظریات قائم کئے ہیں۔ اسی قاعدے کی روسے کہاجاسکتاہے کہ آج جن چیزوں کو حقیقت مان لیا گیا ،کل وہ حقیقت سے خالی ہوسکتی ہیں اورکل آنیوالے سائنسدان ان کی نفی کرسکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کائنات کے خالق و مالک اور مدبرومسخر اللہ رب العالمین نے جو کچھ کہہ دیا، وہ کبھی بدلنے والانہیں، وہی Ultimate Realityاصل حقیقت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہزاروں سال سے وحی کے ذریعے

آنے والی معلومات وہی ہیں ۔تورات کی جن چیزوں کی تصدیق قرآن نے کی ہے، وہ حقائق آج بھی اسی طرح ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کائنات کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک سائنسی علوم کے ماہرین کونہیں ہوا۔ وہ اندازوں سے ان کے بارے میں باتیں کرتے ہیں یا بعض معمولی سطح کی معلومات انہیں ملتی ہیں توان پرنظریئے قائم کرلیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات بدلتے رہتے ہیں جب کہ وحی کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہاں بعض جدید مفسرین اور جدید شارحین کے بارے میں بھی ہم کہتے ہیں کہ کائنات کے تخلیقی اور تدبیری حقائق کے بارے میں وہ احتیاط سے کام لیں۔بعض جدید مفسرین نے یہ طریقہ اختیارکیا ہے کہ قرآن وحدیث کی بعض معلومات کوموجودہ سائنسی نظریات سے ملاتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے سائنسی نظریئے اور انکشافات پیش کرتے ہیں اور اپنی باتیں منوانے کے لئے قرآن و حدیث سے استدلال بھی کرتے ہیں۔

نظریئے ان کے اپنے ہوتے ہیں لیکن وہ ثابت کرتے ہیں کہ پہلے کسی پر یہ عقدے نہیں کھلے۔ حقیقت میں ان پر ڈارون (ارتقاء کا نظریہ پیش کرنے والا سائنس دان) وغیرہ سوار ہوتے ہیں اور وہ جدید سائنس میں قرآن کوشامل کرکے اپنے علم کا لوہا منوانا چاہتے ہیں اور عام پڑھا لکھا طبقہ جودینی علوم سے بالکل بے بہرہ ہوتاہے، ان کے استدلال پر یقین کرکے ان کی تسکین کا باعث بنتاہے۔ایسی کتابوں کو لوگ بہت پڑھتے ہیں اورفہم قرآن کے نام پر قائم ایسے حلقوں میں زیادہ شرکت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جدت پسند معروف عالم نے واقعہ معراج کو سائنسی طریقے سے ثابت کرنے کے لئے بجلی کی رفتار نکال کر براق یعنی نبی ﷺ کی سواری کے حوالے سے معراج کوحقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ وقت اور سواری کی رفتار کے لئے

اعداد و شمار بیان کرتے ہیں۔ عام پڑھے لکھے لوگ ان چیزوں سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔اس سے واقعہ معراج کے لئے ایک جدید تاثر پیدا ہوتا ہے، جبکہ قرآن کا مقصد معراج کو ایک معجزے کے طور پر بیان کرنا ہے۔ اگر معراج کی حقیقت جدید عالم صاحب کے سامنے کھل گئی ہے تو یہ معجزے کی نفی ہے۔ کیونکہ معجزہ انسانی عقل کو حیران کرنے والی اللہ کی نشانی ہوتی ہے۔معراج بھی معجزہ مانا جائے تو ہی صحیح ہے ۔اگر اسے سائنسی دائرے میں آنے والے علم کے طور پر مانا جائے تو غلط ہے۔ اس طریق کار سے بچنا چاہئے۔

اللہ نے کائنات کے بارے میں جس قدر معلومات وحی کے ذریعے دے دی ہیں، وہ جتنی بھی محدود ہوں، انہیں تسلیم کرنا چاہئے۔ نہ تو انکار اس وجہ سے کرنا چاہئے کہ جدید علم میں بعض چیزیں ان سے متضاد ہیں اور نہ ہی ان معلومات کو جوڑ کر دین کے مقابلے میں نئے فلسفے اور سائنسی تجربے پیش کرنے چاہئیں۔ یہ صحیح ہے کہ کائنات کے بارے میں الہامی کتب میں معلومات زیادہ نہیں ہیں۔ اس کمی کو مسئلہ بنا کر شریعت کو ناقص نہ سمجھا جائے کیونکہ کتب سماویہ کا مقصد انسانوں کو وہ ہدایت دینا ہے جس سے دنیا و آخرت میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی حاصل ہو۔کائنات کی خفیہ چیزوں اور مابعد الطبیعات کے حوالے سے کتب سماویہ میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں، وہ ایمانیات سے ہیں۔قاعدہ یہی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے غیب میں رکھا ہے اور ان پر ایمان کا جو تقاضا ہے، انہیں اسی طرح تسلیم کرنا چاہئے۔ ہر کمی بیشی سے ایمان مجروح ہوتا ہے۔ جبکہ صحیح ایمان انسان کے ذہن کو یکسو کرتا ہے اور عمل کی خوبی پیدا کرتا ہے۔ اگر ایمان متزلزل ہو جائے تو انسان میں ذہنی بغاوت کے ساتھ عمل کی بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت میں پڑ کر مسلمان عقیدہ و عمل کو کھو بیٹھے ہیں اور الحادی

نظریات نے دینی عمارت کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج تمام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بے دینی اور بدعملی کی یہی بڑی وجہ ہے ۔پہلے اسی نظریئے نے یورپ اور مغرب کو مذہب سے بے گانہ کیا اور عیسائیت کو باطنی روحانی غذا سمجھ کر چرچ سے معمولی رشتہ باقی رکھا گیا اور تعلیم وثقافت کے اسی سیلاب نے مسلمانوں کو الحاد کی راہ پر ڈال دیا اور آج مسلم معاشروں میں اکثر سیکولر ملحد نام کے مسلمان پنپ رہے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اسلام کے عقائد وایمان کے باب کو پوری طرح وحی کے علمی دلائل کے ساتھ تسلیم کرنا چاہئے اور اس کا ٹکراؤ سائنس و فلسفے کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے۔ سائنسی معلومات سے الگ طور پر فائدہ اٹھانا چاہئے۔ جو چیزیں تجربات میں باربار آچکی ہیں، وہ عموماً فنی نوعیت کی ہیں۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے قدیم زمانے سے آج تک انسان نے تجربات کرکے نئی سے نئی چیزیں تیار کی ہیں۔ دین ان کی نفی نہیں کرتا۔ یہ انسانی صلاحیت ہے جو اللہ نے بندوں کو ودیعت کی ہے اور بندے تجربات کرتے ہیں۔ان چیزوں کا انکار دین کا مقصد ہی نہیں بلکہ نئے تجربے اور نئی تجاویز پسندیدہ ہوتی ہیں۔ خود نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے نئی چیزوں کو پسند کیا۔ خاص طور پر جہاد میں منجنیق وغیرہ کے استعمال اور نئے نئے تجربات کو بہت پسند کیا۔ جہاں سائنس اور فلسفہ کے قیاسی نظریات سے دین پر زد پڑتی ہو، وہاں ان چیزوں کو رد کرکے دین کو ہی حق ماننا چاہئے۔ جن چیزوں میں تضاد ہے، ان کا تعلق عموماً الٰہیات اور مابعدالطبیعات سے ہے۔ ورنہ آگ، ہوا، مٹی اور پانی تو ہمیشہ استعمال میں آنے والی چیزیں ہیں۔ اللہ نے ان کو انسان کے استعمال کے لئے بنایا اور ان کا استعمال انسان کو سکھایا۔ سائنس کو اسی حد تک رکھنا چاہئے۔ اللہ، فرشتوں اور وحی والہام کے حقائق میں اس کو نہیں الجھانا چاہئے۔

یہ بحث اگرچہ عمومی نوعیت کی ہے لیکن یہاں اس لئے کی گئی کہ اس میں الجھ کر لوگ غیبی حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ ان چیزوں میں فرشتوں پر ایمان بھی ایک ہے جس کا جدیدیت پسندوں نے انکار کیا ہے۔

فرشتوں کی انسانوں کی نسبت سے ذمہ داریاں:

قرآن وحدیث میں انسانوں کے تعلق کے باب سے فرشتوں کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ سورۃ الانفطار میں فرمایا:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ○﴾

''یقیناً تم پر نگہبان (فرشتے) مقرر ہیں۔ وہ عالی قدر ہیں، تمہاری باتوں کے لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔'' (۱۲،۱۰)

فرشتوں کا سردار فرشتہ جبریل علیہ السلام ہے۔ اللہ نے ان کے ذمے وحی و ہدایت پہنچانے کا کام لگایا تھا۔ رسولوں کے پاس وحی لے کر آتے تھے۔ قرآن کی وحی کے بارے میں فرمایا:

''اور یہ قرآن اللہ پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتے (جبریل) کے ساتھ اتارا (اے نبی ﷺ) آپ کے دل پر نازل کیا تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو ڈرائیں۔''

اللہ نے کتنے ہی فرشتوں کو اس لئے مقرر کیا ہوا ہے کہ وہ مومن بندوں کے لئے دعائیں کریں۔ سورۃ المومن میں ہے۔

''جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرد جمع ہیں، سب اپنے رب کی تسبیح وتقدیس بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہل

ایمان کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تواپنی رحمت اورعلم کے ساتھ ہرچیز کو محیط ہے۔ پس توان لوگوں کو معاف کردے جنہوں نے توبہ کی اورتیری راہ کی پیروی کی اور توانہیں جہنم کے عذاب سے نجات دے۔ اے ہمارے رب توانہیں ہمیشہ رہنے والے باغات میں داخل کردے جن کا تونے ان سے وعدہ کیاہے اور ان لوگوں کو بھی جنتیوں میں داخل کردے جو ان کے ماں باپ، بیویوں اور اولاد میں سے نیک ہوں۔ تو بیشک زبردست بڑی حکمتوں والا ہے اور توانہیں گناہوں کی سزا سے بچالے اور جس کو تواس دن گناہوں کی سزا سے بچالے گا،اس پرتونے رحم فرمادیا اور یہی عظیم کامیابی ہے۔'' (المومن: ۷،۸،۹)

بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے''ایک شخص اچھی طرح وضوکرکے مسجد کی طرف آتاہے۔ وہ تودنیاوی غرض سے نہیں صرف نماز کی غرض سے آتاہے۔ نماز اسے مسجد کی ترغیب دلاتی ہے ۔ توجتنے قدم بھی اٹھاتاہے ،ہرقدم پر اس کا ایک درجہ بلندہوتاہے اور ایک گناہ معاف ہوتاہے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوجاتاہے۔ جب وہ مسجد میں نماز میں مشغول ہوتاہے اورجتنی دیرنماز اسے روکے رکھتی ہے توفرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں، اے اللہ اس بندے پر رحمت کر .....اے اللہ اسے معاف کردے..... اے اللہ اس کی توبہ قبول کر.....فرشتوں کی دعائیں جاری رہتی ہیں جب تک نماز کے منافی کوئی چیز واقع نہیں ہوتی۔''

بخاری ومسلم کی ایک اور روایت میں ہے''فرشتے رات کو اور دن کو چکرلگاتے ہیں اور فجر اورعصر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں ۔پھروہ اللہ کی طرف چڑھتے ہیں۔اللہ ان سے سوال کرتاہے جب کہ وہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوتاہے کہ تم میرے بندوں کو

کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم انہیں نماز کی حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ فرشتے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں ۔جب وہ اللہ کے ذکر کی مجلس کو پالیتے ہیں تو آوازیں دیتے ہیں کہ آؤ اپنی حاجتوں کی طرف۔ پھر وہ آسمان کی طرف پر پھیلا تے ہیں اور اللہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے تو فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ تیری تسبیح، تیری بڑائی اور تیری حمد بیان کررہے تھے۔پھر اللہ پوچھتے ہیں، کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے، تو فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اے اللہ تجھے تیرے بندوں نے دیکھا نہیں ہے۔ اللہ کہتے ہیں ،اگر وہ دیکھ لیں تو؟فرشتے کہتے ہیں، پھر وہ بندے تیری عبادت میں شدت پیدا کریں گے اور تیری بڑائی اور تیری تسبیح بہت زیادہ کریں گے۔ پھر اللہ پوچھتے ہیں میرے بندے مجھ سے کیا سوال کررہے تھے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تجھ سے جنت مانگ رہے تھے ۔اللہ سوال کرتے ہیں،کیا بندوں نے جنت دیکھی ہے؟ تو فرشتے جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا۔ اللہ سوال کرتے ہیں۔ اگر وہ جنت دیکھ لیں تو؟فرشتے جواب دیتے ہیں کہ دیکھ کر ان کی حرص طلب اور جنت کی رغبت میں بہت اضافہ ہوجائے۔پھر اللہ سوال کرتے ہیں کہ میرے بندے کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے۔فرشتے جواب دیتے ہیں کہ جہنم سے پناہ مانگ رہے تھے۔اللہ پوچھتے ہیں ،کیاانہوں نے جہنم کو دیکھا ہے ؟ جواب دیتے ہیں کہ نہیں دیکھا ۔پھر پوچھتے ہیں کہ اگر جہنم کو دیکھ لیں تو؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اس حالت میں جہنم سے بہت زیادہ دور بھاگیں گے اور اس سے بہت زیادہ ڈریں گے۔ پھر اللہ کہتے ہیں اے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان بندوں کو معاف کر دیا

ہے۔ ایک فرشتہ کہتا ہے کہ مجلس میں فلاں شخص ان میں شامل نہیں ۔وہ اپنی کسی حاجت کے لئے مجلس میں آیا اور ان میں بیٹھ گیا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ذکر کرنے والے ایسے ساتھی ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہوتا۔''

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں۔ تو جبریل علیہ السلام سے اس کا ذکر کرتے ہیں اور اسے حکم دیتے ہیں کہ میں اس بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ جبریل اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر جبریل علیہ السلام آسمانوں میں پکارتے ہیں کہ اللہ فلاں سے محبت کرتے ہیں،تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس بندے کی محبت آسمانوں میں عام ہوجاتی ہے اور جوآسمانوں میں محبوب ہوتا ہے تو زمین والے بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔(بخاری ومسلم)

فرشتوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بیان ہوا ہے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ اللہ کے نافرمان لوگوں پر اللہ کے فرشتے لعنتیں بھیجتے ہیں۔سورہ البقرہ میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَا تُوْا وَ ھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ○﴾ [البقرہ:۱۶۱]

'' بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ کافر ہی مرگئے،تو ان پر اللہ اور اس کے فرشتے اور سب لوگ لعنت کرتے ہیں۔''

فرشتوں کی عمومی صفات اور ان کے کام:

فرشتوں کی ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ حیاء کرتے ہیں ۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا.....صحیح مسلم میں ہے''میں ایسے شخص سے کیوں شرم نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرماتے ہیں۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کوئی شخص پیاز لہسن کھا کر ہماری مسجد میں نہ آئے کیونکہ جس چیز سے انسانوں کو

تکلیف ہوتی ہے، اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔'' (صحیح مسلم)

آپ ﷺ نے فرمایا ''جس گھر میں کتایا تصویر ہو،اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔'' اس کا مطلب ہے کہ گھر میں کتایا جاندار کی تصویر ناپسندیدہ ہے۔ان چیزوں کے ساتھ رحمتیں نہیں ہوتیں ۔ اہل ایمان کو دعوت ہے کہ وہ ان چیزوں سے گھروں کو پاک رکھیں۔

فرشتے اللہ کی طاقتور مخلوق ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں اللہ کے سوا کوئی شمار نہیں کرسکتا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات مجھے بتایا گیا کہ بیت المعمور میں ہرروز ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔ بعض فرشتے وہ ہیں جن کے نام قرآن و حدیث میں آتے ہیں۔ان میں بڑے تین ہیں۔ جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام ۔جبریل علیہ السلام وحی لانے پر مامور تھے ..... میکائیل علیہ السلام جن کا کام بارش اور روزی پہنچانے کا ہے.....اوراسرافیل علیہ السلام قیامت کے دن صور پھونکیں گے۔

موت کے فرشتے بھی مقرر ہیں اور قبر میں بھی فرشتے ہوں گے جو ہرفوت ہونے والے سے سوال کرتے ہیں اور جنت میں فرشتے خدّام ہوں گے اور دوزخ پر بھی داروغہ بنا کر انہیں مقرر کیا گیا ہے اور یہ بھی قرآن و حدیث میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے عرش کو قیامت کے دن آٹھ فرشتے اٹھائیں گے اور روزحشر فرشتے صفیں باندھ کر کھڑے ہوں گے اور جہنم کو زنجیروں کے ساتھ کھینچ کر لائیں گے۔

فرشتوں پر ایمان کی حکمتیں:

فرشتوں پر ایمان کے بہت سے فوائد ہیں۔پہلی بات یہ ہے کہ ہم فرشتوں کے

بارے میں ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جو اللہ نے وحی کے ذریعے بیان کردیں تو ہم مختلف نظریات اور اوہام وغیرہ سے بچ گئے۔ ورنہ گمراہی اور عقیدے کی خرابی سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وحی کے علم سے ناواقف لوگ گمراہ ہوگئے۔کسی نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا دیا اور کچھ ویسے ہی منکر ہوگئے۔ہم قرآن وحدیث پر ایمان لاکر تمام گمراہیوں اور افراط وتفریط سے بچتے ہیں اور فرشتوں پر ایمان کو ایمان بالغیب مانتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کے اوامر ونواہی پر انسان پوری توجہ رکھتا ہے ۔اسے حساب یاد رہتا ہے۔ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ نے میرے کندھوں پر فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو میرے ہر عمل کو محفوظ کررہے ہیں اور قیامت کے دن میرا حساب اللہ کے سامنے پیش کریں گے اور گواہ ہوں گے۔یہ ایمان انسان کو سیدھا رکھتا ہے اور ایک فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ مومن اللہ کی رحمت ونصرت کی امید میں محنت جاری رکھتا ہے۔ اسے مایوسی نہیں ہوتی۔ وہ اگر جہاد میں ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ میدانوں میں اللہ مدد کے لئے فرشتے بھیجتا ہے ۔اسے طمانیت ملتی ہے۔ وہ اللہ کے دین کی خدمت و دعوت میں کھڑا ہوتا ہے، تو اللہ کی مدد پر بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ کے لشکر ہیں، جو مدد کے لئے آتے ہیں۔ اس طرح مومن کو مایوسی نہیں ہوتی۔ وہ ایمان کے ساتھ دامنِ امید تھامے رکھتا ہے۔

فرشتوں پر صحیح ایمان کے ساتھ انسان شرک سے محفوظ رہتا ہے۔فرشتے اگرچہ بہت طاقتور مخلوق ہیں، لیکن کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ۔اس لئے ان سے کچھ نہیں مانگنا چاہئے۔ بہت سے لوگ شرک میں مبتلا ہوگئے کہ فرشتوں کو ہی پکارنے لگے۔بعض لوگ فرشتوں کو پکارتے ہیں اور ان سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔آج کل ایسے تعویز بنائے جاتے ہیں، جن میں ''یاجبریل یامیکائیل'' وغیرہ کے

الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ ایسا کرنا شرک ہے۔ اس سے بچنا چاہئے ۔عامل نجومی لوگ اور بعض کمزور عقیدے کے مولوی حضرات بھی ایسے تعویز باندھنے کے لئے دیتے ہیں یا گھول کر پلاتے ہیں۔ نبی ﷺ سے بعض دعائیں منقول ہیں، جن میں یہ کہہ کر اللہ کو پکارا گیا ہے ''یارب جبرائیل، یارب میکائیل یعنی اے جبرائیل کے رب! اے میکائیل کے رب! لیکن ایسا کہنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اے جبرائیل میری مدد کر، اے میکائیل مجھے فلاں چیز یا اولاد عطا کر۔ پکارنا صرف اللہ کو ہے۔ وہی سب حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے۔فرشتے اللہ کے بندے اوراس کے حکم کے پابند ہیں۔ اللہ ہی دعاؤں کو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے جبکہ فرشتے پکار سے غافل ہیں۔ اللہ صحیح عقیدے پر استقامت عطافرمائے اور ایمان کی دولت سے مالا مال کردے۔ آمین